ہفت روزہ
لیل و نہار
۱۰ جنوری ۱۹۷۱ء

کیا نیا سال
نئے وعدے
لائیگا؟



قیمت مغربی پاکستان میں ۶۰ پ… …قی پاکستان میں ۷۵ پیسے

عالمِ اسلام پر ایک نظر

نمبر شمار	ملک	دارالحکومت	رقبہ	کُل آبادی	مسلمان آبادی	طرزِ حکومت
۱	افغانستان	کابل	۶،۴۷،۴۹۷ کیلومیٹر	۱۵،۵۱،۰۰۰	۹۹ فیصد	بادشاہت ۔ ظاہر شاہ یہاں کے سربراہ ہیں ۔
۲	البانیہ	تیرانہ	۱۰،۷۰۰ مربع میل	۱،۹۶۵،۰۰۰	״ ۷۷	جمہوریت
۳	الجزائر	الجزیرہ	۲،۳۸۱،۷۴۱ کیلومیٹر	۱۲،۵۴۰،۰۰۰	״ ۹۲	جمہوریت ۔ صدر، ہوری بومدین
۴	کیمرون	یاؤنڈے	۴،۳۲،۰۰۰ مربع میل	۵،۴۷۰،۰۰۰	״ ۵۵	جمہوریت
۵	وسط افریقی ری پبلک	پورٹ لامی	״ ۴،۸۸،۰۰۰	۱،۴۵۹،۰۰۰	״ ۶۰	جمہوریت
۶	جمہوریہ چڈ	پورٹ لامی	״ ۴،۸۸،۰۰۰	۳،۴۱،۰۰۰	״ ۸۵	جمہوریت
۷	دہومی	پورٹو نودو	״ ۴۷،۰۰۰	۲،۵۰۵،۰۰۰	״ ۶۰	
۸	حبشہ	عدلیس ابابا	״ ۴،۰۰،۰۰۰	۲۳،۴۵۷،۰۰۰	״ ۶۰	بادشاہت ۔ ہیل سلاسی
۹	گمبیا	باتھرسٹ	״ ۴،۰۰۰	۳۴۳،۰۰۰	״ ۸۴	
۱۰	گنی	کناکری	۲۴۵،۸۵۷ کیلومیٹر	۳،۷۰۲،۰۰۰	״ ۹۵	جمہوریت ۔ صدر شیخ طور
۱۱	انڈونیشیا	جکارتہ	۱،۴۹۱،۵۶۴ کیلومیٹر	۱۰۹،۵۰۰،۰۰۰	״ ۹۴	جمہوریت ۔ صدر سوہارتو
۱۲	ایران	تہران	۱،۶۴۸،۰۰۰ کیلومیٹر	۲۶،۲۸۴،۰۰۰	״ ۹۸	بادشاہت ۔ سربراہ ۔ محمد رضا شاہ پہلوی ۔
۱۳	عراق	بغداد	۱،۷۲،۰۰۰	۸،۴۴۰،۰۰۰	״ ۹۴	جمہوریت ۔ حسن البکر
۱۴	آئیوری کوسٹ	عابد جان	۱۸،۹۰،۰۰۰	۴،۰۱۰،۰۰۰	״ ۵۵	
۱۵	اردن	عمّان	۹۷،۷۴۰ کیلومیٹر	۲،۱۴۵،۰۰۰	״ ۹۱	بادشاہت ۔ شاہ حسین سربراہ مملکت ہیں ۔
۱۶	کویت	کویت	۱۶،۰۰۰ کیلومیٹر	۴۹۱،۰۰۰	״ ۹۹	بادشاہت ۔ اعلیٰحضرت شیخ الصباح مملکت کے سربراہ
۱۷	لبنان	بیروت	۱۰،۴۰۰ کیلومیٹر	۲،۵۲۰،۰۰۰	״ ۵۷	جمہوریت ۔ صدر سلیمان فران جاہ ۔
۱۸	لیبیا	طرابلس	۱،۷۵۹،۵۴۰ کیلومیٹر	۱،۷۳۸،۰۰۰	״ ۱۰۰	جمہوریت ۔ کرنل محمد القضافی ۔
۱۹	ملائشیا	کوالالمپور	۱،۲۹،۰۰۰ مربع میل	۱۰،۰۷۱،۰۰۰	״ ۵۱	بادشاہت ۔ ہز مجسٹی تنکو عبدالحلیم معظم شاہ ۔
۲۰	جزائر مالدیو	مالی	۱۱۵ مربع میل	۱۰۱،۰۰۰	״ ۱۰۰	جمہوریت
۲۱	مالی	باماکو	۵،۸۲،۰۰۰ مربع میل	۴،۷۴۵،۰۰۰	״ ۹۰	جمہوریت
۲۲	ماریطانیہ	نورد ک چوٹی	۱،۰۳۰،۷۰۰ کیلومیٹر	۱،۱۱۰،۰۰۰	״ ۱۰۰	صدارتی طرزِ حکومت ۔ صدر مختار الدّاداہ
۲۳	مراکش	رباط	۴۴۵،۰۵۰ کیلومیٹر	۱۴،۱۴۰،۰۰۰	״ ۹۸	بادشاہت ۔ ہز مجسٹی شاہ حسن سربراہ ہیں ۔
۲۴	نائیجر	نیامی	۱،۲۶۸،۰۰۰ کیلومیٹر	۳،۵۴۶،۰۰۰	״ ۸۹	جمہوریت ۔ صدر ہمانی ریور
۲۵	نائیجریا	لاگوس	۳،۵۷،۰۰۰	۶۱،۴۵۰،۰۰۰	״ ۷۵	جمہوریت، میجر جنرل یعقوب گوان
۲۶	پاکستان	اسلام آباد	۹،۴۶،۷۱۶ کیلومیٹر	۱۲،۲۰۰،۰۰۰	״ ۹۰	عبوری صدارتی دور ۔ صدر آغا محمد یحییٰ خاں ۔
۲۷	سعودی عرب	ریاض	۲،۱۴۹،۶۹۰ کیلومیٹر	۶،۸۷۰،۰۰۰	״ ۱۰۰	بادشاہت ۔ ہز مجسٹی شاہ فیصل سربراہ ہیں ۔
۲۸	سینیگال	ڈاکر	۱۹۶،۱۹۲ کیلومیٹر	۳،۶۷۰،۰۰۰	״ ۹۵	جمہوریت ۔ صدر لیوپولڈ سینگور
۲۹	سیرالیون	فری ٹاؤن	۲۸،۰۰۰	۲،۴۳۹،۰۰۰	״ ۶۵	
۳۰	سومالیہ	موگادیشو	۶۳۷،۶۵۷	۲،۶۶۰،۰۰۰	״ ۱۰۰	جمہوریت ۔ صدر میجر جنرل محمد سعید باری
۳۱	جنوبی یمن	مدینۃ الشعب	۱،۱۲،۰۰۰ مربع میل	۱،۱۴۶،۰۰۰	״ ۹۵	جمہوریت
۳۲	سوڈان	خرطوم	۲،۵۰۵،۸۱۳ کیلومیٹر	۱۴،۳۵۵،۰۰۰	״ ۸۲	جمہوریت ۔ صدر جنرل نمیری
۳۳	شام	دمشق	۷۱،۰۰۰	۵،۶۵۲،۰۰۰	״ ۸۷	جمہوریت
۳۴	تنزانیہ	دارالسلام	۳،۶۲،۷۰۸ مربع میل	۱۲،۱۷۳،۰۰۰	״ ۶۱	بادشاہت
۳۵	توگو	لومے	۲۱،۰۰۰	۱،۷۲۴،۰۰۰	״ ۵۵	
۳۶	تیونس	تیونس	۱،۶۴،۱۵۰ کیلومیٹر	۴،۵۶۰،۰۰۰	״ ۹۳	جمہوریت ۔ صدر حبیب بورقیبہ
۳۷	ترکی	انقرہ	۱،۱۰۰،۱۳۲ کیلومیٹر	۳۲،۷۱۰،۰۰۰	״ ۹۹	جمہوریت ۔ صدر ثنائے
۳۸	متحدہ عرب جمہوریہ	قاہرہ	۱،۰۰۱،۴۴۹ کیلومیٹر	۳۰،۹۰۷،۰۰۰	״ ۹۲	جمہوریت ۔ صدر انوار سادات
۳۹	اپر والٹا	اوگے جوجو	۱،۰۰،۰۰۰	۵،۰۵۴،۰۰۰	״ ۵۵	
۴۰	یمن	صنعاء	۱۹۵،۰۰۰ کیلومیٹر	۵،۰۰۰،۰۰۰	״ ۹۹	جمہوریت ۔ صدر عبدالرحمٰن اریانی

ہفت روزہ
کراچی
لیل و نہار
جلد ۲ | ۴ جنوری ۱۹۷۱ء | شمارہ ۱

ادارۂ تحریر
فیض احمد فیض ـــ حسن عابدی
امین مُغل لاہور ـــ احمد الیاس ڈھاکہ

فون نمبر ـــ ۴۱۷۴۹۸

قیمت
مغربی پاکستان میں ـــ ۶۰ پیسے
مشرقی پاکستان میں ـــ ۷۵ ″
گوادر ـ پسنی میں ـــ ۷۰ ″
برطانیہ میں ـــ ۲ شلنگ ۶ پنس

پوسٹ بکس نمبر ۳۱۷۸/۲۹/۵ ـ کراچی

اسلامی کانفرنس

مُسلم مُلکوں کے وزراء خارجہ کی ۳ روزہ کانفرنس ختم ہو گئی ـ اس کانفرنس کے اغراض و مقاصد ہنوز واضح نہیں ہوئے ہیں اور نہ پتہ چلا ہے کہ اس اجتماع کے پیچھے کون کون سی قوتیں کارفرما ہیں لیکن صدرِ پاکستان نے اپنی افتتاحی تقریر میں اُن اصُولوں کی نشان دہی کردی ہے جن کے تحت حکومتِ پاکستان اس کانفرنس میں شریک ہوئی ہے ـ جنرل یحییٰ خاں نے فرمایا کہ یہ کوئی مذہبی کانفرنس نہیں ہے اور نہ ہم عالمی سیاست میں کوئی نیا اسلامی بلاک بنانے کے خواہشمند ہیں بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ اور افریقی ملکوں کی آزادی اور مسلم ملکوں کے درمیان معاشی ترقی کے لئے باہمی اتحاد و تعاون کی تدبیریں اختیار کریں۔

یہ بڑے زرّین اصُول ہیں لیکن کانفرنس کے دوران میں جو تقریریں ہوئیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مندوبین نے دانستہ یا نادانستہ طور پر اُن دشواریوں اور رکاوٹوں پر غور نہیں کیا جو محکوم مسلم ملکوں کی آزادی اور آزاد مسلم ملکوں کی معاشی ترقی کی راہ میں دیوارِ چین بن کر حائل ہیں ـ مقررین نے مسلمانوں کے اتحاد پر تو بڑا زور دیا لیکن اُن سیاسی اور معاشی وسائل سے گریز کیا جن کو حل کئے بغیر اتحاد کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا ـ مگر وہ سیاسی اور معاشی مسائل ہیں کیا؟

پہلا اور سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ مراکش ہو یا سعودی عرب، ملائشیا ہو یا انڈونیشیا جتنے ملک اس کانفرنس میں شریک ہوئے وُہ سب صنعتی اعتبار سے بہت پسماندہ ہیں ـ اُن کی معیشت کا دامن مغربی سامراج بالخصوص امریکی سامراج سے بندھا ہوا ہے ـ اور اُن کے تیل کے چشموں، گیس کے کنوؤں، ربڑ اور چائے کے باغوں، ٹن اور چاندی کی کانوں اور دوسری خام اشیاء پر امریکی، برطانوی یا ڈچ سامراجیوں کا قبضہ ہے ـ اس دولت کے تحفّظ کے لئے سامراجیوں نے جگہ جگہ اپنے فوجی، بحری اور ہوائی اڈّے قائم کر رکھے ہیں اور بیشتر ملکوں کو فوجی مُعاہدوں کے جال میں پھنسا رکھا ہے ـ کوئی ملک نیٹو کا رکن ہے ـ کوئی سیٹو کا اور کوئی سینٹو کا ـ قرضوں اور فوجی اور غیر فوجی امداد کا بوجھ اس پر مستزاد ہے ـ ایسی صورت میں اسی قبیل کے ملکوں سے یہ توقع عبث ہے کہ وُہ فلسطین اور دوسرے محکوم مسلم ملکوں کی آزادی کے لئے کسی عملی جدوجہد میں شرکت کی جرارت کر سکیں گے ـ مثلاً ہر شخص جانتا ہے کہ اسرائیل امریکی سامراج کا آوردہ اور پروردہ ہے ـ وُہی اسرائیل کو سرمایہ اور سامانِ جنگ فراہم کرتا ہے اور وہی اُس کا پشت پناہ بنا ہوا ہے ـ لہٰذا اسرائیل کی جارحانہ حکمتِ عملی کی مزاحمت وہی قوتیں کر سکتی ہیں جو خود امریکہ کی دستِ نگر نہ ہوں یا جو سامراج کو امن اور آزادی کا دشمن سمجھتی ہوں۔

یہ دُرست ہے کہ اسلامی کانفرنس میں اسرائیل کے خلاف دھواں دھار تقریریں ہوئیں اور اعلامیہ میں اسرائیل سے مفتوحہ علاقوں کو خالی کرنے کا مُطالبہ بھی کیا گیا مگر اسرائیل کا قلعہ فقط خالی خولی تقریروں اور اعلامیوں سے تو فتح نہیں ہو سکتا ـ لُطف یہ ہے کہ اسرائیل کی مذمّت کرنے والوں میں اُن اسلامی مُلکوں کے نمائندے بھی شامل تھے جنہوں نے اب تک اسرائیل سے اپنے تجارتی اور سفارتی تعلقات بھی منقطع نہیں کئے ہیں ـ اگر اسلامی کانفرنس خلوصِ دل سے اس بات کی آرزومند ہے کہ فلسطین آزاد ہو اور کانفرنس کا صدر مقام بیت المقدس ہو تو اُس کو چاہیئے کہ وہ فلسطینی فدائیوں کی مالی امداد کرے، اُنہیں اسلحے اور سامانِ جنگ فراہم کرے اور اُردن کے شاہ حسین کو (جن کا نمائندہ کانفرنس میں شامل تھا) امریکہ اور اسرائیل سے خفیہ سازباز کر کے فدائیوں کی قوت کو کچلنے سے منع کرے ـ کیونکہ فلسطین اگر آزاد ہو گا تو فلسطینی مجاہدوں کی قربانیوں سے ـ جکارتہ اور کوالالمپور کی فوجیں فلسطینیوں کو آزاد کرانے نہیں آئیں گی ـ

عالمِ اسلام کا دوسرا مسئلہ سماجی اور سیاسی ہے ـ اس سطح پر دیکھا جائے تو اسلامی دنیا دو حصّوں

میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک طرف وہ ممالک ہیں جنہوں نے سوشلزم کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔ مثلاً مصر، سوڈان، تنزانیہ، لیبیا، الجزائر، شام، البانیہ اور جنوبی یمن وغیرہ۔ ان ملکوں نے سامراجی قوتوں کو ملک بدر کر دیا ہے اور سامراج کے مقامی ستونوں (یعنی سرمایہ داروں، نوابوں اور جاگیرداروں) کو مسمار کر دیا ہے۔ ان ملکوں میں عوامی حکومتیں قائم ہیں اور وہ عام مسلمانوں کی معاشی فلاح و بہبود کے لئے کوشاں ہیں۔ دوسری طرف وہ ملک ہیں جن میں سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام اپنی تمام خرابیوں کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ بیشتر مقامات پر بدترین قسم کی مطلق العنان بادشاہتیں قائم ہیں اور ملک کی تمام دولت اور طاقت پر شیخوں، شہزادوں اور تنکوؤں کا تسلط ہے۔ اور جہاں مغربی طرز کی نام نہاد جمہوریتیں ہیں وہاں بھی اونچے طبقے ہی راج کرتے ہیں اور عام مسلمانوں کو زندگی کی معمولی سہولتیں بھی نصیب نہیں۔ اسلامی کانفرنس میں بدقسمتی سے غالب اکثریت انہیں ملکوں کی تھی جن میں مسلم عوام سیاسی اور معاشی اقتدار سے محروم ہیں۔ پس اسلامی کانفرنس میں شریک ہونے والے مندوبین کو اگر مسلمانوں کا درد ہے اور وہ واقعی اُن کی معاشی خوشحالی کے خواہاں ہیں تو اُن کا فرض ہے کہ اپنے اپنے ملکوں کے مسلمانوں کو سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور تنکوؤں سے نجات دلوانے کی کوشش کریں۔ چراغ پہلے اپنے گھر میں جلائیے۔ ورنہ لوگ کہیں گے کہ ؎

تو درونِ در چہ کردی کہ برونِ خانہ آئی

مسلم ملکوں کا اتحاد بڑی اچھی بات ہے بشرطیکہ اتحاد کا مقصد بھی نیک ہو۔ اگر اس اتحاد کا مقصد اسلامی دنیا کے رجعت پرست عناصر کو مجتمع اور منظم کرنا ہے۔ اگر اس اتحاد کا مقصد اینگلو امریکی سامراج کی گرتی ہوئی عمارت کو سہارا دینا ہے تو پھر ہم اس اتحاد کو عامۃ المسلمین کے لئے شگونِ بد تصور کریں گے۔ کیونکہ حالیہ انتخابات کے تجربے شاہد ہیں کہ پاکستان کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے اسلام پسندی ہی کی آڑ لے کر مسلم عوام کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنایا تھا۔ اسلامی کانفرنس کے سیکرٹری جنرل تنکو عبدالرحمٰن صاحب نے اپنی تقریر میں جس ذہنیت کا اظہار کیا اُس سے یہی شبہ ہوتا ہے کہ کم از کم اُن کے پیشِ نظر مسلم عوام کا نہیں بلکہ رجعت پرست عناصر کا اتحاد ہے جو مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلتے ہیں اور زبان سے اسلام زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں۔ اتفاق سے تنکو صاحب نے بھی پاکستانی اسلام پسندوں کی مانند انڈونیشیا ہی کی مثال دی اور فرمایا کہ

"ملکوں کی پالیسیوں اور نقطۂ نظر میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن کسی اور سیاسی نظریئے کے مقابلے میں اسلام سب سے زیادہ مؤثر سیاسی قوت ہے، اور یہ تمام تعصبات اور جماعتی اختلافات سے بالا ہے۔ ایک مثال سے میری بات واضح ہو جائے گی۔ جب پرانے (انڈونیشی) نظام نے ملائشیا کو تباہ کرنے کی دھمکی دی اور میرے ملک کے خلاف کھلم کھلا جارحیت شروع کر دی، تو یہ اصحابِ دین ہی تھے جنہوں نے نفرت کی پالیسی کو شفقت میں بدل دیا۔ اسلام پر ہمارا ایمان ہی انڈونیشیا اور ملائشیا کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا ذریعہ بنا۔"

تنکو صاحب یہ بتانا بھول گئے کہ وہ صدر سوکارنو ہی کا انڈونیشیا تھا جس نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان کی ہر ممکن طریقے پر مدد کی تھی اور وزیر خارجہ بھٹو سے کہا تھا کہ جتنا سامان جنگ درکار ہو شوق سے لے جاؤ۔ اور وہ تنکو عبدالرحمٰن ہی کی "اسلامی" حکومت تھی جس نے پاکستان کی مخالفت اور ہندوستان کی حمایت کی تھی چنانچہ پاکستان کو ملائشیا سے سفارتی تعلقات منقطع کرنے پڑے تھے۔ ایسی صورت میں پاکستان کے عوام "دین کے دشمن" سوکارنو کو اپنا دوست سمجھیں گے یا "اسلام پسند" سوہارتو، آدم ملک اور تنکو عبدالرحمٰن کو ــــ ؟

ہمیں اسلامی کانفرنس کے مستقبل کے بارے میں نہ کوئی خوش فہمی ہے اور نہ غلط فہمی۔ اگر تنکو عبدالرحمٰن نے اس ادارے کو سامراجی سازشوں کا مرکز یا اسلامی دنیا کے رجعت پرست عناصر کی آخری پناہ گاہ بنایا تو اس کا حشر بھی وہی ہو گا جو سیٹو، سنٹو اور بغداد پیکٹ کا ہوا۔ البتہ اگر اس ادارے نے اپنے طرزِ عمل کو واقعی مسلم عوام کی فلاح و بہبود اور جمہوری آزادی کی جدوجہد سے ہم آہنگ کیا تو اسلامی کانفرنس کا یہ تاریخی کارنامہ رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔

یونیورسٹی آرڈی نینس کی تنسیخ کے مسلسل مطالبے کے بعد نئی اُجرتوں کے سرکاری اعلان کا مفہوم کچھ یوں نکلتا ہے، گویا حکومت بہتر معاوضے دیکر یونیورسٹی آرڈی نینس کو ان کے لئے "قابلِ قبول" بنانا چاہتی ہے۔

یونیورسٹی آرڈی نینس کی "مقدس دستاویز" کیا قطعی ناقابلِ تنسیخ ہے

اساتذہ کا مطالبہ کب پورا ہوگا!

ڈھاکہ یونیورسٹی سنڈیکیٹ نے ایک قرارداد میں ڈھاکہ یونیورسٹی آرڈیننس کی تنسیخ کا مطالبہ کیا ہے۔ ۲۶ دسمبر کے ایک اجلاس میں جس کی صدارت، وائس چانسلر مسٹر جسٹس اے ایس چودھری نے بذاتِ خود کی، سنڈیکیٹ کے ارکان نے ۱۹۶۱ء کے یونیورسٹی آرڈیننس کی تنسیخ کے ساتھ ہی حکومت سے مطالبہ کیا کہ ایک یکسر نیا اور جمہوری قانون نافذ کیا جائے، جس کے تحت وائس چانسلر کے تقرّر میں نامزدگی کی بجائے انتخاب کا طریقہ رواج دیا جائے اور اساتذہ کو انتظامی معاملات میں بھرپور دلچسپی لینے کا موقع میسّر آئے۔

ایّوب خاں کے دورِ آمریت کا نافذ کردہ یہ آرڈیننس کہ یونیورسٹی آرڈی ننس کے نام سے موسوم ہے غالباً ان کے تمام آمرانہ ضابطوں سے زیادہ سخت جان ثابت ہوا ہے۔ اس مردُود اور رسوائے روزگار آرڈیننس کی تنسیخ کے لئے طلبا کی ملک گیر تحریک اُٹھی، جس نے آمریت کی بنیادیں ہلا دیں اور ملک کے مزدور، دانشور اور دوسرے پیشوں کے لوگ ایّوب خاں شخصی حکومت کا قلعہ مسمار کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

صدر آغا محمد یحییٰ خاں نے مارشل لا کے نفاذ کے بعد عوام سے جو وعدے اصلاحِ احوال کے ضمن میں کئے تھے۔ اُن میں سرِعنوان، طلبہ کے مطالبوں کی تکمیل تھی۔ صدر نے کہا تھا کہ یونیورسٹی آرڈیننس جس کے خلاف طلبہ اور اساتذہ دونوں میں یکساں ناپسندیدگی کے جذبات پائے جاتے ہیں، ختم کر دیا جائیگا اور حکومت درسگاہوں میں بہتر تعلیمی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرے گی۔

صدر کی مذکورہ بالا یقین دہانی کے بعد، اس وقت کے گورنر جناب نور خاں کی سرکردگی میں ایک تعلیمی رپورٹ مرتّب کی گئی اور نئی تعلیمی پالیسی ظہور میں آئی لیکن اس تعلیمی پالیسی پر عمل درآمد کی صورت اب تک نہیں نکلی۔ اور یونیورسٹی آرڈیننس، جس کے بارے میں ایک سال پہلے بھی خیال کیا جاتا تھا کہ بس چند ساعتوں کا مہمان ہے، اب تک بدستور نافذ ہے۔ اس دوران میں مختلف یونیورسٹیوں میں، طلبا اور اساتذہ یونیورسٹی آرڈیننس کی تنسیخ کے لئے پُرزور قراردادیں منظور کر چکے ہیں، علاقائی ہڑتالیں اور مظاہرے کر چکے ہیں۔ انتظامیہ کو یادداشتیں ارسال کی جا چکی

ہیں، غرضکہ احتجاج کی جو بھی صورت ممکن نظر آتی تھی، یکے بعد دیگرے سب اختیار کر لی گئی ہے لیکن یونیورسٹی آرڈیننس کوہِ راسخ کی طرح اپنی جگہ قائم ہے۔

چند ہفتے قبل پاکستان بھر کی یونیورسٹیوں کے نمائندہ اساتذہ کا ایک اجتماع کراچی میں ہُوا تھا، اس موقع پر اساتذہ نے علاوہ دیگر مطالبات کے یونیورسٹی آرڈی ننس کی تنسیخ کا بھی مطالبہ کیا۔ قبل ازیں کراچی یونیورسٹی میں یہاں کی ٹیچرز سوسائٹی یونیورسٹی آرڈی ننس کے خلاف ہفتہ احتجاج منا چکی تھی اور اس کے معزّز ارکان یونیورسٹی میں ایک مظاہرہ بھی کر چکے تھے۔ لیکن نتیجہ، ان سب کارروائیوں کا، وہی ہوا جو اب تک ہوتا آیا تھا۔ احتجاج اور مظاہرہ کرنے والے تھک ہار کر ایک طرف ہو گئے، اور یونیورسٹی آرڈیننس اپنی جگہ قائم رہا۔

اور اب گورنر سندھ کی جانب سے کراچی یونیورسٹی کے اساتذہ کے لئے بہتر تنخواہوں کے گریڈ کا اعلان ہُوا ہے۔ یہ بات تو اساتذہ کو ہی معلوم ہو گی کہ نئے گریڈ اور تنخواہوں کی شرحیں ان کے لئے کس حد تک قابل قبول ہیں، تاہم یونیورسٹی آرڈی ننس کی تنسیخ کے مسلسل مطالبے کے بعد، نئی اُجرتوں کے سرکاری اعلان کا مفہوم کچھ یوں نکلتا ہے۔ گویا حکومت بہتر معاوضے دے کر یونیورسٹی آرڈی ننس کو ان کے لئے "قابلِ قبول" بنانا چاہتی ہے واضح طور الفاظ میں اساتذہ کا منہ بند کرنے کے لئے بہتر معاوضہ کی "رشوت" دی جا رہی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ حکومت اس طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنا پسند کرے گی۔ اور پھر اعلیٰ ترین درسگاہوں کے معزّز اساتذہ کے سلسلے میں، جن سے امید کی جاتی ہے کہ ہماری اعلیٰ اخلاقی علمی اور روحانی قدروں کے امین ہوں گے۔

سوال یہ ہے کہ یونیورسٹی آرڈیننس ایسی کون سی "مقدس" دستاویز ہے، جسے برقرار رکھنا، اربابِ حکومت کے خیال میں، طلبہ اور اساتذہ کی بہتری اور پاکستان کے تعلیمی مستقبل کے لئے نہایت ضروری ہے؟ امرِ واقعہ یہ ہے کہ ایّوب خاں نے اپنے اقتدار کو محفوظ بنانے کے لئے جہاں اور تدبیریں کیں۔ وہیں یونیورسٹی آرڈیننس بھی نافذ کیا، تاکہ ملک کی اعلیٰ ترین درسگاہیں، جہاں سے تحقیق، تجسس طلبِ علم فکری آزادی

اور روشن خیالی کے چشمے پھوٹتے ہیں، بالکل خشک بنجر اور ویران ہو کر رہ جائیں۔ وائس چانسلر کو وسیع اختیارات دے کر ایک ماتحت "آمرِ مطلق" بنا دیا گیا، جو صرف حکومت کے سامنے جواب دہ ہوتا۔ حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وہ اساتذہ کے جمہوری حقوق پر چھاپہ مارنے اور طلبا کی تحریکوں کو کچلنے کے لئے سب کچھ کر سکتا تھا، چنانچہ جامعہ کراچی کی مثال، ان میں سب سے نمایاں ہے جہاں کے وائس چانسلر نے آمریت کی کاسہ لیسی میں افسر شاہی کو بھی مات کر دیا۔ اور اساتذہ میں دھڑے بندی پیدا کر کے ایک دوسرے کے خلاف ریشہ دوانی اور جمہوریت پسند طلبہ کے خلاف تشدّد آمیز حربے اختیار کرنے میں، خاصا "نام" پیدا کیا۔ ایّوب خاں کو معلوم تھا کہ اعلیٰ درسگاہوں میں اگر تعلیم و تدریس کا ماحول ختم کر کے خوشامد سازش، خوف دہشت اور خود غرضانہ نفع اندازی کی فضا پیدا کر دی جائے۔ تو ملک ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے دیوالیہ ہو جائے گا اس کے بعد آمریت سے انکار و مزاحمت کا اندیشہ ہی باقی نہیں رہے گا۔ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے جواں سال اور جواں فکر طلبا اور غیرت مند اساتذہ نے آمریت کی اس سازش کو بروقت بھانپ لیا اور یونیورسٹی آرڈیننس کے نفاذ کے بعد سے ہی اس کی تنسیخ کا مطالبہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ کراچی اور ڈھاکہ کی یونیورسٹیوں میں طلبا کے نام خارج کئے گئے۔ انہیں گرفتار کیا گیا اور شہر بدر کیا لیکن یونیورسٹی آرڈیننس کی تنسیخ کے مطالبے میں شدّت پیدا ہوتی گئی اور وہ تحریک جو ایک جوئے کم آب بن کر اُبھری تھی، آمریت کے لئے سیلِ بلا بن گئی۔

یونیورسٹیوں کے طلبہ اور اساتذہ کیا چاہتے ہیں؟ وہ وائس چانسلر کی آمریت سے نجات چاہتے ہیں۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ اس عہدہ پر تقرّر انتخاب کے ذریعہ ہونا چاہیئے جو متمدن دنیا کا مسلّمہ جمہوری طریقہ ہے۔ نصاب، درس و تدریس اور علمی اور انتظامی معاملات کے تصفیے میں مختلف شعبوں کے سربراہ اور اساتذہ بہرحال اپنی رائے رکھتے ہیں۔ لہٰذا انہیں ہر سطح پر اعتماد میں لیا جائے۔ وہ تمام اختیارات یکم قلم موقوف کیے جائیں جن کے تحت وائس چانسلر، اساتذہ اور طلبہ کے حق انجمن سازی

میں ذہنی رہتا ہے۔ طلبا پر من ملنے فیصلے تھوپتا ہے اور ان کے خلاف وسیع انتقامی کارروائی کر سکتا ہے۔ ان کارروائیوں کے بعد اساتذہ اور طلبا میں یقیناً اعتماد کی فضا پیدا ہوگی۔ اور رفتہ رفتہ بیباکانہ تنقید، آزادانہ اظہار رائے اور جمہوری آزادیوں کے استعمال کا ماحول استوار ہوگا جو بجا طور پر کسی اعلیٰ درسگاہ کے شایانِ شان ہوگا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ علمی حلقوں کی مروجہ دستاویز یعنی یونیورسٹی آرڈیننس کا خاتمہ کیا جائے۔

یہ کھلی دھاندلی بھی

کیا تحقیق طلب ہے؟

کراچی کے ایک شام کے روزنامے نے چند روز پہلے یہ خبر دی تھی کہ امریکی دواساز کمپنیاں، پاکستان میں اپنے ذیلی اداروں سے گٹھ جوڑ کر کے، پاکستانی عوام کو بیحد مہنگی ادویہ فراہم کر رہی ہیں۔ یہ سیدھی سیدھی ڈکیتی ہے، جس کا سدِباب ہونا چاہیئے۔ اخبار نے لکھا تھا کہ بین الاقوامی منڈیوں میں دواؤں کے جو نرخ رائج ہیں، امریکی کمپنیاں پاکستان میں انہی دواؤں کی قیمت، ہزار اور ۸ ہزار فیصد زائد وصول کر رہی ہیں۔ واضح ہو کہ پاکستان میں امریکہ سے درآمد کی جانے والی ادویہ امریکی امداد کے تحت حاصل کی جاتی ہیں۔ یاد رہے کہ اس بے تحاشہ نفع اندوزی بلکہ کھلی لوٹ کی چھان بین، خود امریکہ میں وہاں کی کانگریس کی ایک تحقیقاتی جماعت نے کی تھی۔

اب اسی اخبار کی ایک اطلاع ہے کہ حکومتِ پاکستان نے وزارتِ صحت اور درآمد و برآمد کے اعلیٰ حکام کی ایک کمیٹی قائم کر دی ہے، جو مذکورہ صورتِ حالات کا "مطالعہ" کرے گی۔ البتہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ امریکی کمپنیوں کی اندھا دھند لوٹ کھسوٹ میں مطالعے کا کون سا پہلو باقی رہ گیا ہے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ پاکستان کے پاس زرِ مبادلہ کی مناسب مقدار موجود نہیں کہ دوسرے ممالک سے دوائیں خرید سکے (حالانکہ امریکہ کے مقابلے میں یہ دوائیں سات آٹھ ہزار فیصد سستی دستیاب ہو سکتی ہیں) دوسری بات یہ کہ امریکی کمپنیاں، امریکی امداد کے تحت پاکستان میں دواؤں کی درآمد پر اصرار کرتی ہیں۔ مطلب یہ کہ امریکہ "امداد" کے نام پر پاکستان کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے۔ وہ جو کچھ ایک ہاتھ سے دیتا ہے۔ اس سے زیادہ دوسرے ہاتھ سے چھین لیتا ہے اور اصرار یہ کرتا ہے کہ لوٹ کھسوٹ کا یہ سلسلہ برابر جاری رہنا چاہیئے۔ کیا معاملہ کا یہ پہلو اتنا صریح اور واضح نہیں کہ نصف درجن اعلیٰ حکام اس کے مطالعے کے لئے مقرر کئے جائیں۔ اور مسئلہ حل طلب رہ جائے؟ اور کیا امریکی امداد کی بے رحمانہ لوٹ کے بارے میں اب بھی شکوک باقی ہیں؟ بھلا جو ملک بیماروں کی چارہ سازی جیسے انسانی معاملے میں بھی سات آٹھ ہزار فیصد زائد منافع سے کم پر قانع نہ ہو، اس سے حسنِ سلوک کی کوئی توقع کی جا سکتی ہے؟

حکومتِ پاکستان سے ہماری گذارش ہے کہ پاکستان کے نادار عوام کو امریکی دواساز کمپنیوں کی اس ٹھگی سے نجات دلائے۔ امریکہ سے ادویہ کی درآمد کا سلسلہ فوری طور پر بند کرے اور امریکی کمپنیاں، جو پاکستان میں لوٹ کھسوٹ کا جال پھیلائے ہوئے ہیں، ان کے لائسنس منسوخ کر کے انہیں بحقِ سرکار ضبط کرے۔

یہ مہنگائی بڑھتی ہی جائے گی

ایک مقامی انجمن کی طرف سے بعض غذائی اشیاء کی مہنگائی کا جائزہ مرتب کیا گیا ہے۔ اس جائزے کی رو سے گذشتہ بیس سال کے دوران میں دالوں کی قیمت میں چار ہزار فیصد، بناسپتی کی قیمت میں ۱۱۰ فی صد اسی طرح آٹے، گوشت اور دودھ کی قیمت میں تقریباً چار سو آٹھ سو فیصد اضافہ ہوا ہے۔ مہنگائی کی شرح میں جس تیزی سے اضافہ ہوا ہے، اس کی مثال گذشتہ جنگِ عظیم کے غیر یقینی اور ہیجان انگیز دور میں بھی نہیں ملتی۔

قبل ازیں مہنگائی کی شکایت جب بھی کی گئی، بعض سرکاری، ماہرین کی طرف سے یہ عذر پیش کیا گیا کہ آبادی بڑھ رہی ہے اور اسی تناسب سے لوگوں کے مطالبے بڑھ رہے ہیں، اس کے برعکس پیداوار کی رفتار تیز نہیں، لہٰذا مہنگائی ناگزیر ہے۔ اس دلیل کے ساتھ ہی ایوبی آمریت کے بعض وزیر تو یہاں تک کہہ جاتے تھے کہ اشیائے صرف کی مہنگائی عوام کے بڑھتے ہوئے معیارِ زندگی کی علامت ہے۔ گویا مہنگائی کی اذیت شکوے شکایت کا محل نہیں۔ اس میں بھی ہمارے لئے طمانیت اور تفاخر کا سبب موجود ہے۔ کیونکہ ہمارا معیارِ زندگی "اونچا" ہو رہا ہے۔

بہرحال معیارِ زندگی جب عوام کی قوتِ برداشت سے بھی اونچا ہو گیا اور مہنگائی، گلے میں پھانسی کا پھندا بننے لگی تو عوام نے آگے بڑھ کر آمریت کے ہاتھ قلم کر دیئے۔ لیکن اجارہ دار سرمایہ دار اور صنعت کار، بڑے بڑے آڑھتی اور تاجر جو عوام کے لئے شب و روز مہنگائی کا پھندا تیار کرنے میں سرگرم رہتے ہیں، آمریت کے ہاتھ قطع ہونے کے باوجود اپنے کام میں مصروف ہیں۔

بظاہر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ملک میں آبادی کے ساتھ ہی صارفین کے مطالبے بڑھ رہے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ پیداوار کی رفتار صارفین کے بڑھتے ہوئے مطالبے سے ہم آہنگ کیوں نہیں؟ کارخانے دار اس کا نہایت آسان جواب رکھتے ہیں وہ یہ کہ ملک میں صنعتی امن نہیں آئے۔ دن ہڑتالیں ہوتی رہتی ہیں اس لئے پیداوار بھی کم ہوتی ہے۔ اس کا صریح مطلب یہ ہوتا ہے کہ حکومت کارخانہ داروں کو لائسنس اور محصولات کی صورت میں جس قدر مراعات دے سکتی ہے ضرور دے، کبھی یہ نہ پوچھے کہ وہ اپنا مال بازار میں کس بھاؤ سے بیچتے ہیں اور مال تیار کرنے والے مزدوروں سے کیا، سلوک کرتے ہیں کارخانہ داروں اور بڑے تاجروں کی من مانی کارروائیوں میں اگر مزدوروں نے مداخلت کی یا حکومت نے باز پرس کی (جو وہ بالعموم نہیں کرتی) تو یہ لوگ لاک آؤٹ کر دیں گے، یا ایسے حالات پیدا کر دیں گے کہ ہڑتال ناگزیر ہو جائے پھر مزدوروں سے انتقام لیں گے اور پیداوار کم کر کے حکومت پر دباؤ ڈالیں گے اسطرح مہنگائی پیدا ہوگی اور عام لوگوں کو بھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا اور آج کل تو اس مہنگائی کا ایک "جواز" بھی ہے کہ بڑے بڑے تاجروں اور اجارہ دار سرمایہ داروں نے مرکز اور صوبے کی اسمبلیوں میں "اپنے آدمی" بھیجنے کے لئے کروڑوں روپیہ پانی کی طرح بہایا تھا، لیکن نتیجہ صفر نکلا۔ دولت بھی گئی اور ووٹ بھی ہاتھ میں نہیں آئے۔ عوام نے ان کی سازش ناکام بنا دی۔ اب ان تاجروں اور سرمایہ داروں نے عوام سے انتقام لینے اور اپنی ڈوبی ہوئی رقم نکالنے کے لئے باقاعدہ مہنگائی "نافذ" کی ہے۔

پیپلز پارٹی کے قائد مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور بعض دوسرے سیاسی رہنما بھی حکومت سے مطالبہ کر چکے ہیں کہ تاجروں اور صنعت کاروں کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھے اور اشیاء کی قیمتوں کو اعتدال میں لانے کی سعی کرے۔ لیکن یہ مطالبہ ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے، اور مہنگائی ہے کہ برابر بڑھتی جا رہی ہے۔

اشیاء کی قیمتیں، ادھر دو سال میں جس تیزی سے بڑھی ہیں اس سے سکے کی قیمت پہلے کے مقابلے میں آدھی رہ گئی ہے نتیجہ یہ کہ تنخواہ دار اور معمولی اُجرت پانے والا محنت کش، دو سال قبل کے مقابلے میں بیحد نادار ہو گیا ہے اور اب اگر وہ مہنگائی کے الاؤنس میں اضافہ کرتا ہے تو بالکل حق بجانب ہوگا۔ لیکن اُجرتوں میں اضافہ، مہنگائی کے ازالہ کا صحیح حل نہیں ہے۔ یہ جان لیوا گرانی تو اسی وقت دور ہوگی جب بنک انشورنس کمپنیاں اور بڑے بڑے پیداواری یونٹ قومی ملکیت میں لے لئے جائیں گے اور پیداوار کے عام وسائل پر محنت کش عوام کی مؤثر نگرانی ہوگی ہمیں امید ہے کہ معیاری اکثریت میں کامیاب ہونے والی پارٹیاں عوامی لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی جو وسائل کو قومی ملکیت میں لینے کی پابند ہیں۔ برسرِ حکومت آنے کے بعد عوام کے دکھ درد کا مداوا کریں گے۔

مولانا غلام رسول مہر

ہنگامہ آرائی نہیں، مسائل کا حل ○ چند دردمندانہ گزارشیں

دیکھیو غالبؔ سے مجھے اس تلخ نوائی میں معاف • آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

نری اکثریت، دوسری جماعتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتی، خواہ وہ تعداد میں کتنی ہی بڑی ہو۔ لیکن کیا کوئی ہوشمند لیڈر یا گروہ، اس طرزِ عمل کو ملک و قوم کے لئے مفید قرار دے سکتا ہے؟ ہر گروہ کو ساتھ لینے کی کوشش جاری رہنی چاہیئے۔ خواہ اس کی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو۔ بڑے گروہوں کو نظر انداز کرنا تو صریح حماقت اور میرے نزدیک ایک خویش دشمنی ہے۔

انتخابات کے نتائج سے جو خوشگوار امیدیں پیدا ہوئی تھیں، کیا یہ سمجھا جائے کہ اب ان کے لئے ناخوشگواری کی فضا کے اسباب جمع ہونے لگے ہیں اور ہماری تقدیر میں مسلسل اطمینان و دلجمعی کی کوئی تحریر نہیں رہی؟ کم از کم اخباری اطلاعات سے دل پر یہی اثر پڑتا ہے۔

مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے نتائج انتخابات کے بعد سب سے پہلا کام یہ تھا کہ دونوں طرف کی اکثریت والی پارٹیوں کے لیڈر جلد سے جلد ملاقات کا بندوبست کرتے تاکہ آئندہ کے متعلق خوشگوار طریق کار کی تمام ضروری شقیں طے ہو جاتیں اور بیانات میں اتحاد و اتفاق سے قدم آگے بڑھانے کے یقین کے سوا کچھ نہ آتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ لوگ انتخابات کے ہنگامہ زار کشمکش کو پسِ پشت ڈال کر تعمیری کاموں کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ اس طرح آئندہ کے لئے ملک کی فضا میں ایک اُمید افزا التغیر پیدا ہو جاتا۔

جمہوریت کے بنیادی تقاضے

پھر جو پارٹیاں انتخابات میں شکست کھا چکی تھیں یا ان کی حیثیت بالکل معمولی سی رہ گئی تھی، ان پر کوئی تعریض بروئے کار نہ آتی۔ جمہوریت میں انتخابات عوام کی رائے اور مرضی کا اظہار ہوتے ہیں۔ مسرت کی بات تھی کہ عوام نے اپنی رائے اور مرضی اس پروگرام کے حق میں ظاہر کر دی جس میں عوامی مسائل کے حل کو ہر شے پر مقدم رکھا گیا تھا اور اسے مختلف گروہوں نے مختلف ناموں سے پکارا۔ عوام کا یہ مظاہرہ اللہ کی بارگاہ میں شکر کا معاملہ ہے اور اس سے یہ تاثر لینا چاہیئے کہ جن جماعتوں کا یہ پروگرام تھا، ان کی ذمہ داریوں کا بوجھ بہت بڑھ گیا اسے منزل پر پہنچانے کے لئے حلیمی اور عاجزی کے ساتھ خدا سے دعا کرنی چاہیئے۔ اور سب کو یقین دلانا چاہیئے کہ اللہ کی رحمت سے ہم اپنی قوت و طاقت کا ایک ایک ذرہ اس پروگرام کی تکمیل میں لگا دیں گے۔

آپ بھی ہماری امداد فرمائیں۔ یہ تعریضات کا کون سا موقع تھا؟ جس حد تک مجھے علم ہے، اسلامی شیوہ و شعار بھی یہ نہیں تعریض کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خلاف رائے رکھنے والے کو جتایا جائے، تمہیں عوام نے ٹھکرا دیا۔ اس سے دل آزاری پیدا ہوتی ہے۔ عوامی کاموں کے لئے زندگیاں وقف رکھنے والے لوگ دل آزاری کا شیوہ اختیار نہیں کر سکتے۔ نیز یہ تنگ حوصلہ اور کم ہمت افراد کا کام ہے، جن کے حوصلے بلند اور ہمتیں عالی ہوں، وہ اس قسم کے مشغلوں کو کیوں کر گوارا سمجھ سکتے ہیں؟

پھر بعض اصحاب نے نئے نئے مطالبے پیش کر دیئے مثلاً فلاں کے قتل کی چھان بین کرائی جائے، فلاں فلاں پر مقدمے چلائے جائیں، فلاں فلاں نے عوام کے مقاصد کی مخالفت کی تھی، ان سے ضرور بدلہ لیا جائے گا وغیرہ، یہ ایسی باتیں نہیں، جو انتخابات میں کامیاب ہونے والی پارٹیوں کے لئے زیبا ہوں۔ ہر جماعت اور ہر گروہ نے اپنے خیال کے مطابق سوچ سمجھ کر رائے دی اور اسے کامیاب بنانے کی کوشش کی۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ انہیں ایسی رائے دینے کا حق نہ تھا؟ جمہوری نظام میں تو ایسا خیال بھی میرے نزدیک نفسِ جمہوریت کے منافی ہے۔

محض جمہوری مقاصد کے تحت کام کرنا ضروری نہیں، عوام کو جمہوریت کی تعلیم دینا بھی ضروری ہے

پھر کسی فرد یا گروہ کی رائے کچھ ہو۔ کامیاب ہونے والا گروہ جس پروگرام کو لباس عمل پہنائے گا کیا اس کے لئے شرط لگا دے گا کہ فلاں فلاں اس کے دائرے سے باہر رہیں گے؟ جو کچھ ہو گا سب کے لئے ہو گا۔ خاص گروہوں کے لئے نہ ہو گا۔ اور انتخابات ہو چکنے کے بعد کسی فرد سے ذرا بھی ملال رکھنا، خواہ اسکی رائے کچھ تھی۔ میرے نزدیک قطعاً مناسب نہیں۔ انتخابات ہوتے ہی ہر اختلاف محو ہو جانا چاہیئے۔ البتہ اگر کوئی جماعت اصلاحی اور فلاحی پروگرام کی مخالفت کرے تو اس حد تک اس سے نزاع ہو سکتی ہے، تعمیری اور فلاحی معاملات میں ایسی کوئی بات کسی بھی اعتبار سے مناسب نہیں۔

کسی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا

ایک نہایت رنجیدہ معاملہ یہ ہے کہ کامیاب گروہوں کے مختلف افراد اخباروں میں ایسے بیانات چھپوا رہے ہیں، جو ایک دوسرے کا جواب معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ایسی حالت ہے جیسے دو مخالف گروہوں کے لئے لڑنے جھگڑنے کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ بہ ایں ہمہ وہ اپنے اپنے مورچوں سے مخالفین پر گولے برسا رہے ہیں۔ "ہمیں کسی کی ضرورت نہیں۔" "کوئی ہمیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔" "ہم مخالف بنچوں پر جا بیٹھیں گے۔" وغیرہ من الخرافات۔ چند حقائق بالکل واضح ہیں۔

۱۔ نری اکثریت دوسری جماعتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ خواہ وہ تعداد میں کتنی ہی بڑی ہو لیکن کیا کوئی ہوشمند لیڈر یا گروہ اس طرزِ عمل کو ملک و قوم کے لئے مفید قرار دے سکتا ہے؟ ہر گروہ کو ساتھ لینے کی کوشش جاری رہنی چاہیئے۔ خواہ اسکی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو۔ بڑے گروہوں کو نظر انداز کرنا تو صریح حماقت اور میرے نزدیک خویش دشمنی ہے۔

۲— کسی بڑے گروہ کو محض اس بنا پر اکڑنے کی ضرورت

اعلیٰ سرکاری عہدیداروں کی تنخواہوں میں تخفیف ضروری ہے

نہیں کہ اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہر گروہ کی رائے، مرضی، خواہش اور روش ایسی ہونی چاہیئے کہ وہ ہمہ تن آمادۂ تعاون ہے۔ الّا یہ کہ کوئی اہم معاملہ اس کے لئے روک بن جائے۔ قرآن کا حکم ہے تعاونوا علی البر والتقویٰ (نیکی اور پرہیزگاری کی ہر بات میں تعاون کرو)

۳ — ہر فرد، گروہ اور جماعت پر واضح رہے کہ عوام نے کسی کو جنگ کا تماشا دیکھنے کے لئے منتخب نہیں کیا۔ سب کو ضروری قومی مسائل کے حل کے لئے چُنا ہے۔ یہ وظیفہ کسی کے نظروں سے ایک لمحے کے لئے بھی اوجھل نہ ہونا چاہیئے۔

۴ — ہمارے لئے محض جمہوری مقاصد کے مطابق کام کرنا ہی ضروری نہیں عوام کو جمہوریت کی تعلیم دینا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ مختلف افراد نے جو برسرِ کار آتے رہے ہیں جمہوریت سے بیگانہ کر دیا ہے۔

بہرحال واضح رہے کہ انتخابات کا مقصد ہنگامہ آرائی اور ہنگامہ جوئی نہیں صرف مسائل کا حل ہے۔ جن پر عوام اور ملک و قوم کی بہتری اور بہبود کا انحصار ہے۔ ان مسائل پر توجہ رکھو۔ کسی کے قتل کی تحقیقات کرانا یا مختلف افراد اور گروہوں کے خلاف مقدمے چلانا بجائے خود کتنا ہی ضروری ہو لیکن ان سے ہمارے وہ مسائل حل نہ ہوں گے۔ جن پر ہماری قوم اور ہمارے ملک خصوصاً ہمارے عوام کی بھلائی اور بہتری موقوف ہے۔

وہ مسائل کیا ہیں؟ ان کی سرسری کیفیت یوں پیش کی جا سکتی ہے:-

۱۔ عوام کی تمام تکلیفیں جلد از جلد دُور کرنا۔

۲۔ عوام کے معاشی، تعلیمی اور دوسرے مسائل اس طرح حل کر دینا کہ وہ اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں اور ہمارے معاشرے کے بہترین ارکان بن سکیں۔

۳۔ رشوت کا کامل انسداد۔

۴ — گرانی خصوصاً غذائی جنسوں اور عوامی استعمال کی عام چیزوں کی گرانی کا یہ مسئلہ ایسی صورت اختیار کر گیا ہے کہ بارہا ان مسائل پر توجہ دلائی گئی، مگر کچھ بھی نہیں ہو سکا اور پاکستان بننے کے بعد سے غذائی جنسیں غلّہ، گوشت، سبزیاں، دالیں وغیرہ اتنی گراں ہو گئی ہیں کہ عوام کا گزارا ہو ہی نہیں سکتا۔

۵ — سرکاری ملازموں کی کثرت، جو میرے نزدیک اوّل انگریزوں نے اپنے بعض افراد کو فراہمی روزگار کی مزید مہلت دینے کے لئے پیدا کی۔ مثلاً کمشنر اور ان کے عملے اور خلاصے افراد پاکستان بننے کے بعد ملازم رکھے گئے۔ اس لئے کہ کارفرماؤں کی مصلحتوں کا تقاضا یہی تھا۔ موجودہ عملے میں خاصی تخفیف ہو سکتی ہے۔

۶ — نظم و نسق کے بالادست طبقے کی تنخواہوں میں معتدبہ تخفیف تاکہ وہ عوام کی سطح پر آسکیں یا اس سے قریب تر ہو سکیں اور اسی تناسب سے باقی ملازموں کے مشاہرے میں تخفیف جس کا سلسلہ صدر، گورنروں، سیکرٹریوں اور وزیروں کی تنخواہوں سے ہونا چاہیئے۔

صدر ایوب نے بعض اضافے اپنے آپ کو مختلف طبقوں میں ہردلعزیز رکھنے کی غرض سے کئے تھے جس طرح سول کے محکموں میں تخفیف ہو گی، اسی طرح ہر محکمے میں تخفیف لازم ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب اشیائے صرف کی قیمتیں مناسب حد پر آجائیں گی تو تنخواہوں میں کمی قطعاً غیر مناسب محسوس نہ ہو گی۔

ہمارے ہاں خرابیوں کا دائرہ بہت وسیع اور پُرپیچ ہو چکا ہے۔ جگہ جگہ ایسے گروہ پیدا ہو گئے ہیں کہ جب چاہیں قیمت بڑھا دیتے ہیں اور جب چاہیں گھٹا بھی دیتے ہیں۔ ایسے گروہوں کو ختم کر دینا چاہیئے۔ ان میں کارخانوں کے مالک، سرکاری ملازم اور خدا جانے کون کون شریک ہیں۔ مختلف تجارتوں میں شریک افراد کے دامن بھی پاک نہیں۔

ضروری یہ ہے کہ جلد سے جلد باہم مل کر ایسا انتظام کرنا چاہیئے کہ مل جل کر تعمیری کام ہو۔ کوئی گروہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال نہیں آنا چاہیئے کہ اسے نظرانداز کیا جا رہا ہے کیوں ایسا موقع دیا جائے؟ سب باہم بھائی ہیں۔ سب ایک قوم کے افراد ہیں۔ سب ایک کنبے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے اوضاع و اطوار باہم ہزار درجے بہتر ہونے چاہئیں۔ ہماری جمہوریت اسلامی جمہوریت ہے یہ دوسری جمہوریتوں سے بدرجہا افضل رہنی چاہیئے۔

پاکستان کا پہلا آزاد اخبار

ظلم، استعمار، سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف

روزنامہ

آزاد

لاہور

مجلسِ ادارت

حمید اختر
عبداللہ ملک
آئی اے رحمان

روزنامہ آزاد (جرنلسٹس یونائیٹڈ) ۴ لارنس روڈ لاہور



معراج محمد خاں نے کہا

عوام راست اقدام کرینگے

"میں اسمبلی کا کام نہیں کرسکتا، یہ پارٹی کو منظم کرنے کا وقت ہے"

نعیم آروی

پاکستان پیپلز پارٹی کراچی کے جنرل سیکرٹری معراج محمد خاں ایک روز قبل جیل سے رہا ہو کر کراچی پہنچے تھے۔ اسی دن انہوں نے ایک بڑے جلوس کی قیادت کی اور آرام باغ کے جلسۂ عام سے خطاب کیا۔ ان کے مکان پر پیپلز پارٹی، قومی مزدور محاذ، اور نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے کارکنوں اور مداحوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ لیکن اُن کے چہرے پر تھکن کے آثار نہ تھے۔ انہیں دیکھ کر مشکل سے یقین ہوتا تھا کہ وہ راتوں کے جاگے ہوئے ہیں۔ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "تمہاری آمد کا مقصد سمجھ گیا ہوں۔ رات گیارہ بجے مل لو۔ اطمینان سے گفتگو ہوگی۔"

رات کو ساڑھے گیارہ بجے ان کے گھر پہنچا تو وہ کچھ لوگوں سے اُسی بشاشت اور تازگی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے جو میں نے صبح کے وقت اُن کے چہرے پر دیکھی تھی۔ میرے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ حلقہ ۵ سے میرے انتخاب لڑنے کا مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے۔ اگر اسمبلیوں میں پہنچنے کے بعد کوئی بڑی اور بنیادی تبدیلی آسکتی ہے تو پھر واقعی اسمبلیوں کی ایک ایک سیٹ بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اسمبلیوں میں کسی نمائندے کے پہنچنے اور نہ پہنچنے سے کوئی بنیادی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اصل مسئلہ اسمبلیوں سے باہر رہ کر عوامی جد وجہد کو اسکی صحیح منزل تک لے جانا ہے۔ اسمبلیوں کے ذریعہ کوئی سماجی اور اقتصادی تبدیلی نہیں آسکتی۔ میری اس بات کی شہادت بیشتر انقلابی ملکوں کی تاریخ دے گی جہاں عوام نے اسمبلیوں سے باہر رہ کر ایک مسلسل اور طویل جد وجہد کے ذریعہ اپنے حقوق حاصل کئے ہیں۔ میں نے انتخابات میں اسی لئے حصّہ نہیں لیا کہ میں اپنی جد وجہد کو باہر جاری رکھ سکوں۔ آخر میں وہ طریقہ کیوں اپناؤں جو انقلاب کا طریقہ نہیں ہے۔"

ملک کے حالیہ جمہوری انتخابات کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے معراج نے کہا۔ "مجھے یقین تھا کہ کوئی طاقت پاکستان پیپلز پارٹی کو شکست نہیں دے سکتی۔ کیونکہ پیپلز پارٹی عوام کے صحیح مسائل اور معاشی مسائل کی باتیں کرتی تھی۔ اسیری کے دوران میں ڈیوٹی پر تبدیل ہونے والے سپاہی کبھی کبھی ہمیں اطلاع دیتے تھے کہ پیپلز پارٹی کے امیدوار جیت رہے ہیں جیل کے باہر سینکڑوں لوگ جمع ہو جاتے تھے اور انتخاب جیتنے کی خوشی میں نعرے لگاتے تھے اور فاتحانہ انداز میں اعلان کرتے تھے کہ پیپلز پارٹی انتخاب جیت رہی ہے۔ انہی طریقوں سے انتخابات کے نتائج کی اطلاعات ہم تک پہنچی تھیں۔

یہ ہم سے انتقام لیا جارہا ہے

انتخابات سے قبل رجعت پسندوں نے ایک محاذ بنا رکھا تھا۔ امریکی سامراج کے اشاروں پر اسے اسلام اور کفر کے درمیان آخری معرکہ قرار دیا جا رہا تھا۔ پاکستان کو انڈونیشیا بنانے کی دھمکی دی جارہی تھی۔ رجعت پسند لیس کانٹے سے لیس ہو کر ملک کے مزدوروں، کسانوں، صحافیوں اور طالب علموں پر پوری طاقت سے حملہ آور تھے۔ ان کے پاس بے پناہ وسائل تھے۔ جبکہ عوامی کارکن وسائل سے محروم تھے۔ مگر عوام نے انہیں انتخابات میں شکست دے کر ثابت کر دیا کہ وہ بالآخر انقلابی محاذ پر بھی انہیں آخری شکست دے کر ملک سے اُن کا نام و نشان مٹا دیں گے۔

مجھے انتخابات میں پیپلز پارٹی یعنی عوام کی کامیابی سے خوشی ہوئی، رجعت پسند ہم سے انتقام لینے والے تھے مگر انتخابات کے نتائج سے وہ بادل چھٹ گئے، لیکن انتخابات میں کامیابی سے مجھے یہ فکر بھی دامنگیر ہوئی کہ اگر اسمبلیوں میں جانے والوں نے عوام کے مسائل حل نہ کئے تو عوام ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے، ویسے میرے نزدیک پیپلز پارٹی کی کامیابی غیر متوقع نہ تھی۔

نوجوان رہنما معراج محمد خان نے کہا کہ میں ضمنی انتخابات میں کھڑا نہیں ہوں گا۔ ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام کرتا ہے، میں اسمبلی کا کام نہیں کرسکتا۔ یہ پارٹی کو منظم کرنے کا وقت ہے۔ پیپلز پارٹی کو ایک انقلابی پارٹی کہا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پیپلز پارٹی ایک انقلابی پارٹی کا کردار انجام دے۔ پارٹی کو سوشلسٹ نظریئے پر منظم کیا جائے اور میں یہ کام زیادہ مؤثر اور بہتر انداز میں انجام دے سکتا ہوں۔

میرے ایک سوال کے جواب میں معراج محمد خاں نے کہا کہ ملک کے دونوں بازوؤں کے عوام نے نظریاتی طور پر سوشلزم کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے، لیکن محض اس فیصلے سے موجودہ نظام تبدیل نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس پر اجارہ دار، سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوکر شاہی کی گرفت مضبوط ہے، انتخابات میں یہ عناصر شکست کھانے کے بعد عوام سے انتقام لینے کے لئے اشیاء کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ کر رہے ہیں۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کو ایک دوسرے سے لڑانے کی مکروہ سازشیں ہو رہی ہیں، تاکہ رجعت پسندوں کو کسی نہ کسی طرح تحفظ مل جائے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں۔

دونوں صوبوں کے عوام کو ۲۳ سال سے سرمایہ داروں جاگیرداروں اور نوکر شاہی نے دونوں ہاتھوں سے لوٹا ہے۔ دونوں صوبوں کے عوام کے اصل دشمن یہی عناصر ہیں۔ یہی لوگ عوام کی اقتصادی بدحالی کے ذمہ دار ہیں چنانچہ دونوں صوبوں میں عوامی جد وجہد کا رخ عوام دشمن طاقتوں کی طرف موڑنا چاہیئے۔ سرمایہ دار اور جاگیردار اور رجعت پسند ایک سازش کے ذریعہ منافرت کو ہوا دے رہے ہیں وہ موجودہ حالات کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنی لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ جاری رکھ سکیں دونوں صوبوں کے عوام کو اس بات سے آگاہ رہنا چاہیئے کہ ان کے اصل دشمن کون ہیں اور وہ کیا عزائم رکھتے ہیں۔ مغربی پاکستان کے عوام کو مشرقی پاکستان کے عوام کی بھرپور حمایت کرنی چاہیے۔ اور اسی طرح مشرقی پاکستان کے عوام کو مغربی پاکستان کے محنت کشوں، مزدوروں، کسانوں، کی حمایت کرنی چاہیئے دونوں کے مسائل یکساں ہے دونوں کا دشمن ایک ہے۔

مشرقی اور مغربی پاکستان میں عوامی جد وجہد عالمی جد وجہد یا تحریک کا ایک حصّہ ہے۔ دونوں صوبوں کے عوام مغرب کے سرمایہ دارانہ

سیاسی اور اقتصادی نظام کا جوا اپنے گلے سے اتار پھینکنا چاہتے ہیں، دنیا بھر کے عوام سوشلسٹ نظریئے کے تحت اپنے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں صوبوں کے عوام بھی سوشلسٹ نظام کے ذریعہ اپنی سماجی سیاسی اور اقتصادی زندگی میں بنیادی انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ سوشلزم ہی دونوں صوبوں کے عوام کے سیاسی اور اقتصادی مسائل کا واحد حل اور فکری و عملی ہم آہنگی و یگانگت کا حتمی ذریعہ ہے۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ پیپلز پارٹی کیا شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ سے کوئی اتحاد یا سمجھوتہ کرے گی معراج محمد خاں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ پیپلز پارٹی غیر اصولی اتحاد کبھی نہیں کرے گی دونوں پارٹیوں کے درمیان اتحاد کا بنیادی اصول پاکستان سے استحصال اور ناانصافی کا خاتمہ ہے اگر اس اصول پر شیخ مجیب الرحمٰن تیار نہیں ہوتے تو کوئی اتحاد نہیں ہو سکتا۔

معراج محمد خان نے کہا کہ صوبائی سطح پر اگر پیپلز پارٹی نے عوام سے کئے گئے وعدے پورے نہ کئے تو ہم پارٹی کا ساتھ نہ دیں گے بلکہ عوام کا ساتھ دیں گے۔ پارٹی دفعتاً اصلاحات نافذ نہیں کر سکتی۔ اس میں یقیناً کچھ وقت لگے گا ہم عوام کو اپنے اعتماد میں لے کر انہیں اپنی مشکلات سے آگاہ کریں گے اور جس طرح ممکن ہو سکا ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی جائے گی میں اس بات کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ اگر ہماری پارٹی نے عوام کے بنیادی مسائل حل نہ کئے تو اس کا حشر قائد اعظم کی مسلم لیگ سے مختلف نہ ہوگا۔ پیپلز پارٹی نے عوام کے ہاتھوں میں داؤد آدم جی اور سہگل کے جابرانہ معاشی تسلط کے خلاف جو تلوار دی ہے۔ اگر ہم مسائل حل نہ کر سکیں تو انہیں اس بات کا حق ہوگا کہ وہ ہمارے خلاف بھی تلوار اٹھائیں

ہمیں اپنی کامیابی کا یقین تھا

معراج محمد خان نے پیپلز پارٹی کی کامیابی کی وجوہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ ۲۳ سال سے اس ملک کے عوام کا معاشی استحصال کیا گیا سامراج کے پروردہ بڑے سرمایہ دار جاگیردار نوکر شاہی اور ان کے ایجنٹ سیاسی لیڈر نئے نئے بھیس میں عوام کے اعتماد کا خون کرتے رہے، عوام ایک طویل عرصے سے اپنی سماجی اور معاشی زندگی میں بنیادی تبدیلی کے منتظر تھے، عوام کا مسئلہ اقتصادی مسئلہ تھا لیکن رجعت پسند لیڈروں اور پارٹیوں نے ایک بار پھر اسلام کے نام پر عوام کو فریب دینے کی کوشش کی، اور اسلام خطرے میں ہے کا نعرہ بلند کیا اس کے برعکس پیپلز پارٹی نے اقتصادی پروگرام پر زور دیا عوام نے پیپلز پارٹی کا ساتھ دے کر ثابت کر دیا کہ وہ اقتصادی تبدیلی کے خواہش مند ہیں۔

پیپلز پارٹی کے نوجوان رہنما نے بڑی افسردگی کے عالم میں کہا، جیلیں اصلاح کا کام انجام دیتی ہیں، لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک کی جیلیں استحصالی نظام کو برقرار رکھنے کے لئے ہیں۔ قیدیوں کی اصلاح کرنے کے بجائے انہیں عادی مجرم اور سماج دشمن بننے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جیل کے حکام کے بہیمانہ سلوک سے قیدیوں کے دل و دماغ میں دنیا بھر سے نفرت کرنے اور انتقام لینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ میں جب بھی جیل گیا، وہاں کے حالات اور قیدیوں کی بے چارگی دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ قیدیوں کے ساتھ بڑی ناانصافی کی جاتی ہے، انہیں جانوروں سے بدتر غذا دی جاتی ہے۔ انہیں علاج کی کوئی سہولت حاصل نہیں ہے، ان کے ساتھ انتہائی بہیمانہ اور غیر انسانی سلوک کیا جاتا ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جیلوں میں چھوٹے اور پچھلے طبقے کے افراد زیادہ آتے ہیں، قیدیوں کی اکثریت سماج کی ستائی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ معاشی اور سماجی مجبوریوں کی وجہ سے جرم کرتے ہیں۔ موجودہ قانون انہیں مجرم ٹھہرا کر لمبی مدت کی سزائیں دیتا ہے، لیکن اس ملک کے اجارہ دار، سرمایہ دار، اور نوکر شاہی کے ایجنٹ گھناؤنے اور مکروہ جرم کرنے کے بعد بھی قانون کی دستبرد سے محفوظ رہتے ہیں۔ میرے نزدیک مجرم وہ لوگ نہیں ہیں جو معمولی جرم پر لمبی لمبی سزائیں بھگت رہے ہیں بلکہ اصل مجرم وہ استحصالی سماج ہے جو پچھلے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو جرائم پر اکساتا ہے، یہاں کی جیلوں میں ایسے بے شمار قیدی ہیں جنہیں پولیس جھوٹے مقدموں میں پھنسا کر جیلوں میں پہنچا دیتی ہے۔ تین تین سال سے بعض مقدموں کی سماعت نہیں ہوتی ہے، اور بعض قیدی لمبی لمبی مدت سے سزا سنے بغیر قید کی سزا بھگت رہے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ عادی مجرموں کی اصلاح کے لئے انہیں ایک باعزت زندگی گزارنے کا موقع دینا چاہئیے ان کے اندر اس بات کا اعتماد پیدا کرنا چاہئیے کہ وہ ایک باوقار اور باعزت شہری کی طرح زندگی گزار سکتے ہیں۔ خصوصاً سزائے موت کے قیدیوں کی سزائیں معاف کر کے انہیں ایک بار پھر زندگی گزارنے کا موقع دینا چاہئیے۔ اور ساری جیلیں خالی کر دینی چاہئیں۔ مارشل لا کے تحت جن لوگوں کو موت کی سزا یا دوسری سزائیں دی گئی ہیں، ان کی سزائیں معاف کر دینی چاہئیں۔ یا کم از کم ہائیکورٹ میں انہیں اپیل کرنے کی اجازت ملنی چاہئیے۔

قیدیوں سے ناانصافی

انہوں نے کہا کہ اگر کسی ایک شخص کو سزا ملتی ہے تو اس کا پورا کنبہ بے سہارا ہو جاتا ہے۔ موجودہ سماج اسے کوئی تحفظ نہیں دیتا، اس کا نتیجہ یہ کہ ایک آدمی کے جرم کی سزا اس کے پورے کنبے کو بھگتنی پڑتی ہے۔ اس طرح کنبے کے بیشتر افراد بے سہارا ہونے کے بعد مجبوراً جرائم کے راستے پر چل نکلتے ہیں۔ پیپلز پارٹی برسر اقتدار آتے ہی جیلوں کی اصلاح کی جانب فوری طور پر توجہ دے گی، اور اس قسم کے واقعات اور حالات کے سدباب کے لئے ٹھوس اقدامات کئے جائیں گے تاکہ ہمارے ملک سے جرائم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں۔

معراج محمد خاں نے اپنی گرفتاری کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ میری گرفتاری میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا ہاتھ تھا۔ مجھے جان بوجھ کر جھوٹے مقدموں میں پھنسا کر قید کیا گیا تاکہ میں سوشلزم کا پیغام عوام تک نہ پہنچا سکوں، مگر میری گرفتاری سے اس انقلابی مہم میں کوئی تعطل پیدا نہ ہوا۔ کیونکہ میری طرح کچھ لوگ سوشلسٹ پروگرام کو عوام تک پہنچانے کی عظیم ذمہ داری بہ حسن و خوبی پوری کر رہے تھے، کسی کے قید ہونے سے انقلابی نظریے کا سوتا خشک یا بند نہیں ہو جاتا۔ وہ پوری طاقت اور رفتار سے جاری رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوشلسٹوں کے قتل، گرفتاری اور جلاوطنی کے بعد بھی نصف سے زیادہ دنیا میں سوشلزم تیزی سے پھیل چکا ہے، اور یہ عمل برابر جاری ہے۔

میں نے جیل میں کیا دیکھا

معراج محمد خاں نے بتایا کہ مجھے گرفتار کر کے پنڈی جیل لے جایا گیا، وہاں مجھے ایک پھٹا ہوا کمبل دے کر ایک انتہائی غلیظ کمرے میں بند کر دیا گیا کئی گھنٹوں کے بعد جب معلوم ہوا کہ میں پیپلز پارٹی کا آدمی ہوں تو مجھے اس جگہ سے نکالا گیا۔ شاید جیل کے حکام پیپلز پارٹی کے خلاف تھے۔ تین ماہ تک جیل میں مجھے ایسی جگہ رکھا گیا جہاں چرس استعمال ہوتی تھی۔ اور قیدیوں کو عادی مجرم بنانے کا کام بڑی یکسوئی سے کیا جا رہا تھا۔ جیل میں اسمگلروں اور قاتلوں کو بی کلاس دی گئی تھی، ہمارا مقدمہ زیر سماعت تھا پھر بھی ہمیں عام قیدیوں کی طرح رکھا گیا۔ اگر جیل کے حکام سے اس بارے میں کہا جاتا تو وہ جواب دیتے کہ قانون میں ایسی کوئی دفعہ موجود نہیں ہے کہ ہمارے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے۔

معراج محمد خاں نے میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ پارٹی کو انقلابی بنیادوں پر منظم کریں گے، دور دراز علاقوں میں رہنے والے عوام تک اس کا پروگرام اور منشور پہنچائیں گے، خاص طور پر کسانوں، اور مزدوروں کو منظم اور باشعور کریں گے تاکہ وہ عوامی انقلاب میں اپنا انقلابی کردار ادا کر سکیں اور وہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ تشدد کا جواب تشدد سے دے سکیں۔

انہوں نے کہا کہ عوام پرامن ہیں۔ وہ تشدد کرنا نہیں چاہتے اگر ان کے ساتھ مزید ناانصافی کی گئی اور ان کے مسائل میں اضافہ کیا گیا تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں اپنے بچاؤ کی خاطر ہتھیار اٹھانے سے نہیں روک سکتی۔

جیل میں طارق عزیز کے روز و شب



پاکستان پیپلز پارٹی کے نوجوان اور مقبول رہنما طارق عزیز بقول شخصے ان دنوں نئی نسل کو سویپ (SWEEP) کر رہے ہیں۔ سیاست میں آنے سے قبل وہ ٹی وی اور فلم کے ایک منجھے ہوئے اور مقبول آرٹسٹ کی حیثیت سے معروف تھے مگر سیاست کے سنگلاخ راستے میں قدم رکھنے کے بعد وہ پاکستان کے پسے ہوئے مظلوم عوام کے دلوں کی دھڑکن بن چکے ہیں۔

طارق عزیز نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز مارچ ۱۹۷۰ء میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کی کسان ریلی سے کیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا "میں ایک کسان کا بیٹا ہوں اور بالآخر کسانوں میں آ گیا ہوں"۔ پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہونے کے بعد طارق عزیز نے سیاست میں عملاً حصہ لینا شروع کیا۔ انتخابات سے قبل انہیں باغیانہ تقریر کرنے کے جرم میں پس دیوار زنداں ڈال دیا گیا اور جب وہ ۷۰ دن قید رہنے کے بعد ۲۳ دسمبر کو معراج محمد خاں کے ساتھ کراچی پہنچے تو عوام نے ان کا تاریخی استقبال کر کے ثابت کر دیا کہ عوام کے لئے جیل کی کال کوٹھریوں کو آباد کرنے والے اور دار و رسن کی آزمائشوں سے گذرنے والے عوام کے دلوں میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہتے ہیں۔

طارق عزیز نے بتایا کہ گرفتاری کا علم مجھے پہلے ہو چکا تھا گرفتاری سے قبل میں نے اپنی والدہ کو ذہنی طور پر اس واقعہ کے لئے تیار کر لیا تھا۔ والدہ اس بات سے خوش تھیں کہ ان کا بیٹا اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ گرفتاری کی رات کو تقریباً ڈیڑھ بجے مقامی پولیس نے اُن کے گھر پر چھاپہ مارا۔ انہوں نے اپنے کپڑوں کا بکس پہلے ہی تیار کر لیا تھا، اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، ڈی ایس پی نے ریسور اُٹھایا، اُدھر سے کچھ کہا گیا۔ ادھر سے جواب دیا گیا۔ "نو سر اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی، وہ تو تیار بیٹھا ہے"۔ گرفتاری کے وقت وہ بالکل نارمل تھے، البتہ جب انہیں گرفتار کر کے بریگیڈ تھانے پہنچایا گیا تو اس وقت وہ کچھ ڈسٹرب ہوئے۔

"مجھے گرفتار کر کے تقریباً ڈھائی بجے بریگیڈ تھانے لے جایا گیا اور کمرے کی فرش پر مجھے بٹھا دیا گیا۔ میرے ارد گرد کچھ "اخلاقی مجرم" بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے کا بلب جل رہا تھا اور ایک افسردگی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے "اخلاقی مجرموں" کو دیکھ کر بڑا رحم آیا۔ ان کے چہرے پر انسان کی ازلی سادگی اور معصومیت تھی۔ ان میں سے ایک شخص تو بار بار کہہ رہا تھا، "میں بے قصور ہوں خدا کے لئے مجھے گھر جانے دو۔ میں بالکل بے قصور ہوں"۔ اس وقت میں کچھ پریشان ہوا، ایک خیال، ایک سوال بار بار میرے ذہن میں اُبھر رہا تھا۔ میں کون ہوں، کیا ہوں اور کس اخلاقی جرم کی پاداش میں یہاں لایا گیا ہوں؟"

طارق عزیز نے کہا کہ عدالت میں میری ٹائپ شدہ تقریر کو انتہائی بد وضع اور مسخ شدہ انداز میں پیش کیا گیا۔ اس میں گرامر اور ٹائپنگ کی سینکڑوں غلطیاں تھیں۔ میری تقریر کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے دیا گیا۔ میں نے عدالت سے اس بات پر احتجاج کیا اور کہا کہ میری تقریر کے اس ٹائپ شدہ حصے میں اصل حقائق کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ اس میں گرامر اور جملوں کی بناوٹ میں ایسی فاش غلطیاں ہیں جس کی توقع ایک مڈل کلاس کے بچے سے بھی نہیں کی جا سکتی ہے۔ پولیس کے کام کرنے کا انداز انتہائی دقیانوسی اور قدیم ہے۔

انہوں نے بتایا کہ جد و جہد نے مجھ سے فنکار کی نازک مزاجی چھین لی ہے، میری سوچیں کھُردری اور حقیقت پسند ہو گئی ہیں۔ جیل میں عام قیدیوں کے حالات دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوا۔ حکام کا رویّہ افسر شاہی کی بدترین مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔ عام حالات میں قیدیوں کو سوال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، انہیں ایک مقررہ مدّت میں سوال کرنے یا اپنی پریشانی بیان کرنے کی اجازت ہوتی ہے، وہ بھی اس طرح سے کہ قیدیوں سے بڑے تحکمانہ لہجے میں کہا جاتا ہے کہ "حضور میں پیش ہو جاؤ"۔ "سوال کرو"۔ انسان کے وقار کو مجروح کرنے کا اس سے بہتر نسخہ جیل میں ابھی تک دریافت نہیں ہوا ہے۔

طارق عزیز نے کہا کہ جیل ایک خوف کا شہر ہے، ظلم و جبر کی دنیا ہے، جہاں انسان سے اس کے تمام اوصاف اور نیکیاں چھین کر اس کے رگ و پے میں نفرت اور انتقام کا زہر انڈیل دیا جاتا ہے، ایک سفید داڑھی والا ضعیف قیدی روزانہ ہماری کوٹھری کی صفائی کرنے آتا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے جھاڑو

سخن فہم قیدی

طارق عزیز نے بتایا کہ حیدر آباد جیل میں ایک چھوٹی سی لائبریری بھی ہے۔ جیل میں کتابیں بہت خستہ حالت میں رکھی ہوتی ہیں۔ اکثر قیدی کتاب پڑھنے کے بعد اس پر اپنا نام اور قید کی مدت لکھ دیتے ہیں۔ لائبریری میں اُردو کے ممتاز شاعر فیض احمد فیض کا شعری مجموعہ "دستِ صبا" بھی ہے، دستِ صبا کو متعدد قیدیوں نے پڑھ رکھا ہے۔ اس کتاب پر جگہ جگہ اُمید، دوری، فراق، ہجر، درد جیسے الفاظ کے نیچے نہایت گہرے نشان لگائے گئے ہیں، ایک شعر میں "برفیں" لکھا گیا ہے، ایک قیدی نے اس کے نیچے نشان لگا کر نوٹ لکھا ہے، برف کا جمع برف ہوتا ہے۔ برفیں غلط ہے۔

محمد دین قیدی، عمر قید ۱۴ سال۔ حیدر آباد جیل۔

"جیل، ایک خوف کا شہر ہے، ظلم و جبر کی دُنیا ہے، یہاں انسان سے اُس کی تمام نیکیاں چھین کر رگ و پے میں نفرت اور انتقام کا زہر انڈیلے دیا جاتا ہے۔"

ایک ماں کے جرم کی سزا، اس کے معصوم بچّہ کو بھی مل رہی ہے

چھین کر ایک طرف رکھ دی۔ اور اسے اپنے پاس بٹھا کر سگریٹ پینے کو دیا۔ وہ رونے لگا۔ کچھ ہی دیر میں اس کی سفید داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔ اس نے بتایا کہ میں گھر سے آٹا لینے نکلا تھا۔ پولیس نے آوارہ گردی میں دھر لیا وہ بار بار کہتا تھا "میرے بعد میرے گھر کی کیا حالت ہوگی، میرے معصوم بچوں پر کیا گذر رہی ہوگی، میں کچھ نہیں جانتا۔ خدایا مجھے کس گناہ کی سزا مل رہی ہے"۔

طارق عزیز نے ایک دوسرا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا ہماری کوٹھری کے عقب میں قتل میں ماخوذ عورتوں کا وارڈ تھا، جس میں چند عورتیں چودہ چودہ سال کی سزائیں بھگت رہی تھیں، ایک عورت کا پانچ چھ سال کا بچہ بھی تھا، اکثر رات کے سناٹے میں اس بچّے کی رونے کی آواز میرے جسم وجاں کو لرزا دیتی تھی۔ کبھی کبھی وہ بچہ ہمارے پاس بھی آیا کرتا تھا۔ بھوک کی وجہ سے وہ بہت لاغر اور کمزور دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد تھا، آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے، چھوٹی چھوٹی معصوم آنکھوں میں دنیا جہان کا ڈر اور خوف سمٹا ہوا تھا پہلے دن اس نے مجھے بڑی وحشت زدہ نظروں سے دیکھا، لیکن جب میں نے اسے کھانے کے لئے بسکٹ دیا تو شاید جیل میں پہلی بار اس کی آنکھوں میں دوستی اور اعتبار کی چمک پیدا ہوئی تھی، وہ اکثر بسکٹ کھانے کے بعد آسودگی سے سو جاتا، قتل اس کی ماں نے کیا تھا، سزا اس کے بچّے کو بھی مل رہی تھی۔ اس چھوٹے سے بھگنا بچے کی دنیا میں جیل کا ایک نیم تاریک کمرہ اور تھوڑی سی روشنی تھی۔ ماں قاتل تھی، مگر اس کے بچّے کا کیا قصور تھا۔

طارق عزیز نے میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ فنکاروں کو عملی سیاست میں بھرپور حصّہ لینا چاہیئے۔ کیونکہ فنکار عوام سے علیحدہ نہیں ہیں، ہمارے ملک کی یہ روایت رہی ہے کہ جب کبھی عوام نے معاشی اور سیاسی حقوق کی جدوجہد شروع کی فلمی فنکاروں نے اپنے آپ کو اس عوامی جدوجہد سے الگ تھلگ رکھا۔ اس طرح عوام کی معاشی اور سیاسی حقوق کی جدوجہد میں شامل نہ ہونے سے فن کار عوام سے کٹ جاتے ہیں وہ اپنے اس عمل کی وجہ سے ابھی تک عوام میں باوقار مقام پیدا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اگر ہمارے یہاں کے فن کار عوامی جدوجہد میں عوام کے شانہ بشانہ چلیں تو انہیں یقیناً عوام کے درمیان ایک جائز اور باوقار مقام نصیب ہوگا۔ میں نے عملی سیاست میں حصّہ لے کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ فلمی صنعت سے تعلق رکھنے والے فن کار ٹیکنیشنز اور محنت کش معاشرہ کے ایک زندہ اور متحرک طبقہ کے لوگ ہیں، اور وہ عوام سے کوئی علیحدہ حیثیت نہیں رکھتے۔ بلکہ معاشرے کے دیگر طبقوں کے ساتھ مل کر معاشی اور سیاسی حقوق کی جدوجہد میں بھرپور حصّہ لینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ میں نے اپنے عمل سے عوام اور صنعت کے درمیان کھڑی ہوئی اونچی اونچی فصیلوں اور برجیوں کو گرا دیا ہے۔

طارق عزیز نے کہا کہ جیل جانے سے ان کی فلمی سرگرمیوں میں تعطّل پیدا ہوا ہے، خاص طور پر فلم "سوداگر" کی شوٹنگ جو سوات میں ہونے والی تھی محض ان کے جیل جانے سے نہ ہو سکی۔ سوداگر میں انہیں اپنا کردار اس لئے پسند ہے کہ وہ برطانوی سامراج کا ایک مخالف کردار ہے۔ جسے عوام بھی پسند کریں گے۔ عوامی تحریک میں شامل ہونے سے ان کی ذاتی فلم بے حد متاثر ہوئی ہے۔ یہ فلم ابھی تک نامکمل ہے، جوں ہی حالات سازگار ہوئے اپنی فلم کا کام شروع کر دیں گے جب انہوں نے خدا کی بستی۔ کو فلمانے کا تہیّہ کیا تو کاروباری لوگوں نے ان کی سخت مخالفت کی اور پروڈیوسروں کو یہ کہہ کر بھکانے کی کوشش کی کہ طارق سوشلسٹ ہے۔ مروا دے گا"۔

> ## اگر جیل میں چھاپہ مارا جائے
>
> ○ طارق عزیز نے اپنی اسیری کا زمانہ حیدرآباد سنٹرل جیل میں گذارا۔
>
> ○ طارق عزیز نے بتایا کہ جیل میں کچّے قیدیوں سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ انہیں کام کرنے کے لئے باہر بھیجا جاتا ہے، اور پیسے جیل کے حکّام اپنی جیب میں ڈال لیتے ہیں۔
>
> ○ پاکستان کی جیل پر اگر چھاپہ مارا جائے تو کم از کم پانچ من افیون اور چرس برآمد ہوگی۔
>
> ○ جیل خانے سے پہلے طارق عزیز کی پانچ فلمیں افشاں، سوداگر، چراغ کہاں، روشنی کہاں، نہ ہے نصیب اور ذاتی فلم آگ میں پھول زیرِ تکمیل تھیں۔ جیل سے رہائی کے بعد ابھی تک انہیں کسی نئی فلم کا کنٹریکٹ نہیں ملا۔

طارق عزیز نے سنسر بورڈ کے قواعد وضوابط پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ فلم معاشرے کی برائیوں، خصوصاً نوکر شاہی کی برائیوں کی نشاندہی نہیں کر سکتی۔ اگر کرتی ہے تو سنسر بورڈ کی نذر ہو جاتی ہے، سنسر بورڈ کے قواعد سخت بیہودہ ہیں۔ ان کے تحت مقصدی فلم بنائی نہیں جا سکتی۔ سنسر بورڈ میں پروڈیوسر کو بیٹھنے نہیں دیا جاتا، حالانکہ جس طرح مصوّر اپنی بعض تصویروں کا مفہوم ومعنی بیان کرتا ہے، اسی طرح فلم کے بعض مناظر کی تشریح کے لئے فلم کے خالق کا اس جگہ موجود ہونا بے حد ضروری ہے۔ گھٹیا اور معیار سے گری ہوئی فلموں کی تمام تر ذمہ داری سنسر بورڈ پر عائد ہوتی ہے۔ اگر سنسر بورڈ کے قواعد تبدیل کر دیئے جائیں تو ہماری فلمیں یقیناً عوامی زندگی کے مسائل اور عوامی تحریک کی عکاسی کرنے لگیں گی سنسر بورڈ کی موجودہ روش نے فلمی صنعت کی سوچ پر پھٹیہ لگا دیا ہے، اور سوچنا جرم قرار دے دیا ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری بیشتر فلمیں فرسودہ اور پٹے پٹائے موضوعات پر تیار ہوتی ہیں۔

طارق نے کہا کہ پیپلز پارٹی کی کامیابی سے اب حالات تبدیل ہوں گے، پہلے فلمی صنعت کے لوگ دبے دبے رہتے تھے، مگر عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کی کامیابی سے اسٹوڈیو میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اسٹوڈیو میں مٹھائیاں تقسیم کی گئیں، نئے حالات کی تبدیلی کی بہت اچھی علامت ہے کہ فلمی صنعت کے لوگ اب عوام کی سیاسی اور معاشی جدوجہد کا ساتھ دیں گے۔

طارق عزیز نے کہا کہ میں کچھ ہم خیال لوگوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، اگر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو ایسی فلمیں تیار کروں گا۔ جو سوشلسٹ خیال پر مبنی ہوں گی۔

طارق عزیز نے میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ الیکشن ہمارے مسائل کا کلی اور حتمی حل نہیں ہے۔ یہ ایک مرحلہ ہے۔ جس سے پوری قوم بڑی کامیابی کے ساتھ گزری ہے اگر الیکشن سے عوام کی توقعات پوری نہ ہوئیں تو وہ جدوجہد کا راستہ اختیار کریں گے اور انقلاب برپا کر کے اپنے حالات بدل ڈالیں گے، عوام کے گھروں میں آٹے کا کنستر خالی ہے۔ وہ کنستر بھرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس کے بعد بھی ان کے کنستر خالی رہے تو وہ خالی کنستر لے کر سڑکوں پر نکل آئیں گے۔

طارق عزیز نے بتایا کہ ہم اسمبلیوں کے اندر اور باہر اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے، اسمبلیوں میں جانے والے اگر اپنے وعدے سے پھر گئے تو ہم باہر رہ کر ان کا محاسبہ کریں گے ان ممبروں پر کڑی نگاہ رکھی جائے گی جو عوام کے اعتماد سے منتخب ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ضمنی انتخاب میں حصّہ لینے کا میں قطعی ارادہ نہیں رکھتا۔

پیپلز پارٹی کی کامیابی اور سوشلسٹ پروگرام سے اس ملک کے اجارہ دار سرمایہ دار اور بڑے جاگیردار بوکھلا اٹھے ہیں۔ رجعت پسند طاقتوں کی پسپائی سے سامراج جھلّا اٹھا ہے چنانچہ عوام سے انتقام لینے کے لئے اشیائے صرف کی قیمتوں میں ناقابلِ برداشت اضافہ کر دیا گیا ہے سامراج اور سرمایہ دار پیپلز پارٹی کی غیر معمولی کامیابی کو ناکامی میں تبدیل کرنے کی زبردست سازش میں

نیپ کو مولانا بھاشانی نے کس طرح ناکام بنایا؟

قومی کانفرنس کے خاتمے پر مولانا "بیمار" پڑ جائیں گے

نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ مولانا بھاشانی نے ۹ جنوری کو اپنے گاؤں سنتوش (ادرنگر) میں "مشرقی پاکستان قومی کانفرنس" طلب کیا ہے۔ یہ وہی سنتوش ہے جہاں ایک سال قبل ۱۹ جنوری ۱۹۷۰ء کو مولانا بھاشانی نے کسان کانفرنس منعقد کی تھی اور جس میں انہوں نے بڑی شدّت کے ساتھ قومی یکجہتی اور ملک کی سلامتی کا نعرہ لگاتے ہوئے بدنام زمانہ امریکی ادارہ سی آئی اے کی ایک خفیہ دستاویز کا بھی انکشاف کیا تھا اور جو بقول مولانا صاحب مشرقی اور مغربی پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور مشرقی پاکستان میں عوامی جمہوریہ چین کے خلاف ایک "بفر اسٹیٹ" قائم کرنے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اس کسان کانفرنس کے دوران مولانا بھاشانی اور ان کی پارٹی کے جنرل سکریٹری جناب طٰہٰ کے درمیان اختلافات کھل کر سامنے آئے تھے اور مولانا بھاشانی نے اپنے سابق جنرل سیکرٹری پر الزام لگایا تھا کہ مشرقی پاکستان کو الگ کرنے والے اس سی آئی اے دستاویز کو جناب طٰہٰ عوام کے سامنے پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

ایک سال کے مختصر عرصے میں ملک کی سیاسی صورتحال بڑی حد تک تبدیل ہو چکی ہے۔ اس سیاسی تبدیلی سے خود نیشنل عوامی پارٹی بھی متاثر ہوئی ہے۔ پارٹی کے اندر نظریاتی اختلافات اور بھی زیادہ شدید ہو چکے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں نیشنل عوامی پارٹی کو عوامی لیگ کے بعد دوسری بڑی سیاسی جماعت کہا جاتا تھا لیکن ۱۹۷۰ء کے قومی و صوبائی اسمبلی کے انتخابات نے وقتی طور پر اس خیال کو غلط ثابت کر دیا ہے۔

ایک سال کے اس مختصر عرصے میں نیشنل عوامی پارٹی کو ایک طرف ملک کی داخلی سیاسی صورت حال سے اپنی پالیسیوں کو ہم آہنگ کرنے اور دوسری طرف پارٹی کے اندرونی انتشار پر قابو پانے کے لئے مختلف قسم کے نعرے ایجاد کرنے پڑے اور پارٹی چیف کو کئی آزمائشی مراحل سے گذرنا پڑا۔ نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ نے ایک سال کی مدت میں اپنے کئی رفقاء سے علیحدگی اختیار کی جن میں جناب طٰہٰ اور جناب عبدالحق بھی شامل ہیں۔ پارٹی کے بعض ارکان پر مولانا بھاشانی نے کھلے عام تنقید کی اور انہیں "کمیونسٹ" قرار دیا۔ بعض کے بارے میں فرمایا کہ یہ اقلیتی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور پاکستان کی سلامتی اور قومی یکجہتی کے بارے میں ان کے احساسات مشکوک ہیں۔ پارٹی کے کچھ اراکین کے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ یہ لوگ انتہا پسند ہیں اور اپنی "انقلابی پالیسیوں" سے پارٹی کے مفاد کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

ایک سال کے دوران صرف یہی نہیں کہ نیپ کے یہ داخلی تضادات قومی پریس کے ذریعے منظر عام پر آتے رہے بلکہ مشرقی پاکستان کے بعض علاقوں میں گروپ بندی نے ایک ایسی شکل اختیار کر لی کہ علاقائی طور پر ہر گروپ نے اپنے آپ کو منظم کرنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی بنگال اور مشرقی بنگال میں نیشنل عوامی پارٹی کی سیاست دو مختلف سمت میں تقسیم ہو گئی۔ "عوامی" اور "مسلح انقلاب" کے کئی فلسفے تشکیل پا گئے اور محنت کش کسانوں اور مزدوروں کی یہ سب سے مضبوط اور منظّم سیاسی تنظیم، انقلابی فلسفوں کے گورکھ دھندوں میں اُلجھ کر رہ گئی۔ ان حالات میں جب ملک میں پہلی بار بالغ رائے دہی کی بنیاد پر جمہوریت کی بحالی کے لئے انتخاب کے انعقاد کا اعلان ہوا تو نیپ کی مرکزی قیادت کا "سیاسی دیوالیہ پن" بھی پہلی بار عوام پر منکشف ہوا۔

ایک سال میں دو ناکامیاں

نیشنل عوامی پارٹی قومی کونسل کے اجلاس سے لیکر صوبائی کونسل کے اجلاس تک انتخاب میں حصہ لینے کے سوال پر متضاد پالیسی پر گامزن رہی۔ یہ جمہوری عمل میں نیپ کی براہِ راست ناکامی تھی۔ اسی طرح "گھیراؤ جلاؤ" کی تحریک سے لے کر "ووٹ سے پہلے نجات" کے نعرے تک نیپ کی مرکزی قیادت ایک بھی صحیح منزل کا انتخاب نہیں کر سکی۔ جسے ہم انقلابی عمل میں نیشنل عوامی پارٹی کی ناکامی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

ایک سال کے دوران ان دو ناکامیوں کے بعد اب مولانا بھاشانی مشرقی پاکستان کی "انقلابی سرزمین" پر اپنے "ایک نکاتی" نعرے کا بیج بو رہے ہیں۔ مولانا بھاشانی جو اس وقت ملک کے سب سے بزرگ سیاستدان ہیں، اپنی طویل سیاسی جدوجہد کے دوران میں غالباً اب وہ آخری تیر استعمال کرنا چاہتے ہیں جو ان کے سیاسی ترکش میں باقی رہ گیا ہے۔ لیکن کیا اب بھی وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو سکیں گے؟ (...) مصروف ہیں۔ لیکن مجھے اس بات پر مکمل یقین ہے کہ پختہ سیاسی شعور رکھنے والے عوام کسان، انقلابی مزدور اور طالب علم، سامراج اور رجعت پسند طاقتوں کی پکائی ہوئی سازش کی ہنڈیا کو پھوڑ دیں گے۔ موجودہ حکومت پر اس بات کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ سرمایہ داروں پر کڑی نگاہ رکھے اور قیمتوں میں اضافہ کی سازش کو ناکام بنا دے۔ حکومت اپنے وسائل اور نشر و اشاعت کے ذرائع کو استعمال میں لاکر مارکیٹ کو ہر صورت میں اعتدال پر رکھے۔

طارق عزیز نے کہا کہ ملک میں ۲۳ سال سے بائیں بازو کی طاقتیں مصلحت اور شخصیت پرستی کا شکار رہیں، قوم کو کھل کر صحیح بات بتانے کی جرأت نہیں کی گئی، موجودہ حالات تبدیل کرنے کے لئے ہمیشہ انقلابی قدم اٹھانے سے گریز کیا گیا۔ اسی لئے لفٹ کی طاقتیں مار کھاتی رہیں۔ اب ہم مرتے مر جائیں گے، سمجھوتہ نہیں کریں گے اگر کوئی سوشلزم کے نام پر عوام کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرے گا تو ہم اسے بے نقاب کر دیں گے۔

طارق عزیز نے اپنے متعلق ایک دلچسپ بات بتائی انہوں نے کہا مجھے کئی بار لالچ دیا گیا مگر میں نے ہر لالچ کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ ایک مرتبہ لاہور ایئر پورٹ پر کنونشن مسلم لیگ کے ایک لیڈر نے کہا کہ اگر تم ہمارے ساتھ ہوتے تو تمہارے وارے نیارے ہو جاتے، عیش کرتے، دھڑا دھڑ ملیں ملتیں، مگر تم نے اپنے مستقبل پر لات مار دی۔ انہوں نے ایک پیشکش بھی کی مگر میں نے مارے غصّہ اور نفرت کے ان کی طرف دوبارہ دیکھنا گوارا نہ کیا۔ کچھ لوگوں نے ہماری خاموشی کی بھی قیمت لگائی تھی۔ مگر ہم نے انکار کیا اور ببانگ دہل حق کا اعلان کیا۔ میرے والد زندگی بھر لفٹ رہے، ترقی پسند طاقتوں کا ساتھ دیتے رہے اور اس سلسلے میں انہوں نے بڑے بڑے نقصانات بھی اٹھائے مگر زندگی کے آخری لمحے تک ان کے قدم نہیں ڈگمگائے انہوں نے ہمیشہ ہر خوف اور لالچ سے بالاتر ہو کر حق کا اعلان کیا۔ طارق عزیز نے بتایا کہ ان کے والد آزاد پاکستان پارٹی اور عوامی لیگ کے باقاعدہ سرگرم کارکن تھے۔

طارق عزیز نے بتایا کہ سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لینے کی بنا پر مجھے مالی نقصانات اٹھانے پڑے ہیں مگر میں انہیں اپنا نقصان نہیں سمجھتا کیونکہ میں جس مقصد کے لئے عوامی تحریک میں شامل ہوا ہوں وہ مالی منفعت سے بالاتر ہے اس کے علاوہ مجھے اپنی ذات پر اعتماد ہے میں جب چاہوں گا ان نقصانات کو پورا کر لوں گا۔ طارق عزیز نے بڑے عزم کے ساتھ کہا کہ عوامی جدوجہد میں حصّہ لینا ایک مقدّس فرض ہے اور میں اس بات سے مطمئن ہوں کہ اپنا فرض پورا کر رہا ہوں۔

نشانہ باز ہیں کہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرلیں گے؟ اس سوال کا جواب بڑی آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ہمیں مولانا کی ماضی کی زندگی میں بھی جھانکنا ہوگا اور اس ملک کے ۱۳ کروڑ باشندوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کرنے والے اس سیاسی رہنما کی نفسیات پر بھی گہری نظر رکھنی ہو گی۔

مولانا صاحب قیام پاکستان سے قبل تک برِصغیر کی مختلف انقلابی تحریکوں میں شامل رہے ہیں انہوں نے خلافت تحریک میں بھی حصہ لیا اور کانگریس کی سیاسی جدوجہد میں بھی شریک ہوئے۔ لیکن اُن کی سیمابی طبیعت نے انہیں کسی ایک تحریک سے منسلک نہیں ہونے دیا تحریک پاکستان میں حصہ لینے اور سلہٹ کو پاکستان میں شامل کرانے کے بعد مولانا بھاشانی پاکستان کی بانی سیاسی تنظیم مسلم لیگ سے بھی برگشتہ ہوئے۔ مولانا اقتدار کے خواہاں کبھی نہیں رہے البتہ انہوں نے جب بھی یہ محسوس کیا کہ کسی سیاسی جماعت کے ساتھ اُن کی وابستگی عوامی جدوجہد کی راہ میں حائل ہو رہی ہے تو فوراً انہوں نے اُس سیاسی جماعت سے علیحدگی اختیار کرلی اور عوامی جدوجہد میں اپنی قائدانہ صلاحیتوں کے ساتھ شامل ہوگئے۔ قیام پاکستان کے بعد جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ مسلم لیگ عوام کی نمائندہ جماعت نہیں رہی تو انہوں نے ۱۹۴۹ء ہی میں یہاں افتخار الدین مرحوم اور میر مانکی شریف کے ساتھ مل کر ایک نئی سیاسی تنظیم کی تشکیل کی جدوجہد شروع کر دی۔ یہ اُسی جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ سہروردی مرحوم اور مولانا بھاشانی نے مشرقی پاکستان میں عوامی مسلم لیگ کی داغ بیل ڈالی۔ لیکن جب عوامی لیگ کے سہروردی مرحوم اپنی پارٹی کے سربراہ کی پالیسی سے انحراف کرنے لگے اور ملک کی خارجہ پالیسی کا جھکاؤ امریکہ کی طرف ہونے لگا تو سامراج دشمن مولانا بھاشانی کے لئے اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ ایک ایسی نئی سیاسی تنظیم قائم کریں جو نہ صرف اِس ملک کے کروڑوں عوام کو جاگیرداری، سرمایہ داری اور استحصالی معاشرے کی چنگل سے نجات دلائے بلکہ ان قوتوں کے سرچشمہ امریکی و برطانوی سامراج کے خلاف بھی عوام جدوجہد کی لہر کو تیز کرے۔ نیشنل عوامی پارٹی مولانا بھاشانی کی اپنی خواہشوں اور امنگوں کی ترجمان تھی۔

عوام دوست اور سامراج دشمن

مولانا بھاشانی نہ صرف سیاسی طور پر ایک انقلابی رہنما ہیں بلکہ فطری طور پر بھی وہ کٹر قوم پرست سامراج دشمن ہیں اور ان کی ابتدائی سیاسی زندگی سے آج تک اگر ہم ان کی سیاسی جدوجہد کا تجزیہ کریں تو ہمیں اِس جدوجہد میں جس مولانا بھاشانی کی شخصیت اُبھرتی ہوئی نظر آتی ہے وہ علیحدگی پسند، یا عصبیت کا شکار بھاشانی نہیں بلکہ ایک عوام دوست محب وطن سامراج دشمن اور انقلابی لیڈر کی شخصیت ہے لیکن یہ شخصیت اپنی سیماب صفت طبیعت اور غیر مستقل مزاجی کے باعث خود اپنے فکری اور سیاسی تضادات کا شکار ہو گئی۔

مولانا کی شخصیت کے اِس تجزیے کے بعد اگر ہم آج ان کے نئے نعرے یعنیٰ قرارداد لاہور کے مطابق ایک آزاد و مختار مشرقی پاکستان کا قیام" کا جائزہ لیں تو سب سے پہلے ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایک سال کی سیاسی ناکامیوں نے نیشنل عوامی پارٹی کی جس تنظیمی قوّت کو انتشار میں مبتلا کر دیا ہے، مولانا بھاشانی اس ٹوٹتی اور بکھرتی ہوئی قوت کو ایک بار پھر یکجا کر کے ملک میں لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی سیاسی صورتِ حال کو عوامی قوتوں کے تابع کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا علیحدگی پسند نہیں

"آزاد و خود مختار مشرقی پاکستان" کے نعرے کو اتنی آسانی سے علیحدگی کے نعرے پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مغربی پاکستان کو "اسلام علیکم" کہنے کے باوجود مولانا بھاشانی کی تقریروں میں آج بھی ایسے تضادات پائے جاتے ہیں جو خود اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ وہ ایک سال کے اندر علیحدگی پسند بن چکے ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا بھاشانی نے گذشتہ ۱۲ دسمبر کو جیسور میں جو تقریر کی ہے اُس میں صرف بنگالیوں کی نہیں بلکہ ۱۳ کروڑ پاکستانیوں کی بات کہی ہے۔ ان کی تقریر کا یہ جملہ قابلِ غور ہے کہ۔

"۱۳ کروڑ پاکستانیوں کے لئے یہ بات باعث شرم ہے کہ حالیہ طوفان کی تباہیوں کی شکار ہماری ماؤں بہنوں کی ننگی اور مسخ شدہ لاشوں کو غیر ممالک سے آئے ہوئے فوجی دستوں نے دفنایا۔"

اِسی طرح ۱۹ دسمبر کو کھلنا میں تقریر کرتے ہوئے مولانا بھاشانی نے کہا کہ "قرارداد لاہور پر مکمل عمل درآمد سے "پورے ملک" کے لوگوں کے مابین یک جہتی اور مستحکم دوستی کو برقرار رکھنا بالکل آسان ہو جائے گا۔"

مولینا بھاشانی جس "قرارداد لاہور" کی بنیاد پر "آزاد و خود مختار" مشرقی پاکستان کا نعرہ بلند کر رہے ہیں ضروری نہیں کہ اس سے اتفاق کیا جائے البتہ ہم یہاں ان سیاسی مبصرین کی رائے کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے جن کے خیال میں یہ نعرہ ایک طرف نیپ کو انتشار سے بچانے کے لئے اور دوسری طرف "چھ نکات" کے اثرات کو زائل کرنے اور عوامی لیگ سے سیاسی قیادت چھیننے کے لئے لگایا گیا ہے۔ اور ۹ جنوری کو سنتوش میں منعقد ہونے والی قومی کانفرنس اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اب یہاں وہی ایک سوال جواب طلب رہ جاتا ہے کہ کیا مولینا بھاشانی اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوسکیں گے؟

اس سلسلے میں بھی ہمیں چند امور پر بحث کرنی ہو گی۔

پہلی بات یہ کہ اس "قومی کانفرنس" سے قبل مولینا بھاشانی نے کونسل کا اجلاس طلب کیا تھا جسے انہوں نے ملتوی کر دیا۔ لیکن انہوں نے اپنی پارٹی کی تمام ضلعی شاخوں کے صدر اور سیکرٹری کو ہدایت کی ہے کہ وہ قومی کانفرنس سے ایک روز قبل اپنے اپنے علاقوں سے مندوبین روانہ کریں تاکہ اس قرارداد پر پارٹی کی سطح پر غور و خوض کیا جائے۔ جس کی توثیق مولینا صاحب قومی کانفرنس میں کرانا چاہتے ہیں۔

بعض مبصرین کا خیال ہے کہ نیپ کی اس "مندوبین کانفرنس" میں وہ لوگ شریک نہیں ہوں گے۔ جنہوں نے پارٹی چیف کی ہدایت کو نظرانداز کرتے ہوئے انتخاب میں حصہ لیا تھا ان لوگوں میں نیپ کے سینئر نائب صدر اور مولینا بھاشانی کے ایک پرانے رفیق حاجی دانش کے علاوہ صوبائی نیپ کے جوائنٹ سیکرٹری جناب نورالہدا قادر بخش بھی شامل ہیں۔ جن کے بارے میں یہ اطلاع ملی تھی کہ انہوں نے پارٹی کی جوائنٹ سیکرٹری شپ کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا ہے ایک خبر یہ بھی ہے کہ مولینا بھاشانی نے صرف اس لئے کونسل کا اجلاس ملتوی کرادیا ہے۔ کیونکہ اس میں ان کے خلاف پارٹی کے ایک حلقے کی طرف سے عدمِ اعتماد کی تحریک پیش ہونے والی تھی بہر حال جو بھی بات رہی ہو یہ خدشہ اب بھی اپنی جگہ موجود ہے۔ کہ "مندوبین کانفرنس" میں نیپ کی مرکزی قیادت پر سخت تنقید کی جائے گی۔

تضادات کچھ اور نمایاں ہوں گے

دوسری بات یہ کہ جس دن اخبارات میں قومی کانفرنس کی تاریخ کا اعلان ہوا اسی دن ڈھاکہ سٹی نیپ کی مجلس عاملہ توڑ دی گئی۔ اور اس کی جگہ ایک ایڈ ہاک کمیٹی قائم کر دی گئی جبکہ کنوینر سٹی نیپ کے صدر جناب عبدالجلیل صاحب اور مسیح الرحمن دونوں ایک دوسرے کی پالیسی سے اختلاف رکھتے ہیں اور دونوں قومی کانفرنس کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔

تیسری بات یہ کہ اس مندوبین کانفرنس میں نیپ کے داخلی تضادات ایک بار پھر کھل کر سامنے آئیں گے جس سے قومی کانفرنس کا متاثر ہونا ناگزیر ہوگا۔

ان حالات میں مولینا بھاشانی کی یہ طلب کردہ "مشرقی پاکستان قومی کانفرنس" کہاں تک کامیاب ہو سکے گی اس کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ جس پس منظر میں یہ کانفرنس طلب کی گئی ہے اس کے نتیجے میں اس سے زیادہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ مولینا بھاشانی اس کانفرنس میں ایک ایکشن کمیٹی بنائیں گے۔ اور کچھ عرصے تک شور و ہنگامہ کے بعد "بیمار" پڑ جائیں گے۔

سفارتی افسر مودودیت کی تبلیغ کے لئے اپنی سرکاری حیثیت استعمال کر رہے ہیں

ڈاکٹر فیروز احمد

واشنگٹن میں جماعت اسلامی اور پاکستانی سفارتخانے کا گٹھ جوڑ

اس سے پہلے ایک مضمون میں ہم اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ امریکہ میں پاکستانی سفارت خانے نے کس طرح جماعتِ اسلامی کے کارکنوں کو پاکستانی طلبار کی تنظیم پر مسلط کیا۔ اس تنظیم کے رسالے کی باگ ڈور چند ترقی پسند افراد کے ہاتھوں میں تھی جو سفارت خانے کے دباؤ کے باوجود پاکستان کے سماجی مسائل پر ایک صحت مند بحث جاری رکھے ہوئے تھے۔ یہ پالیسی سفارت خانے کے لئے قطعی ناقابلِ برداشت تھی۔ لہٰذا یہ لازمی تھا کہ کسی نہ کسی طرح سے ان افراد کو ہٹا کر اُن کی جگہ رسالے کے منصب ادارت پر ایسے مدیر کھونپے جائیں جو حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے سے انکار نہ کریں چنانچہ مہینوں کی مسلسل تنظیمی کوشش کے بعد جون میں ہونے والے پاکستانی طلبار کے اجلاس میں سفارت خانے اور جماعت کے ملے جُلے دستے کو پاکستانی طلبار کی تنظیم پر قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ جلسہ میں شریک ہونے والے بہت سے افراد کا خیال تھا کہ سفارت خانے کا مقصد فقط ترقی پسند مدیر کو ہٹانا تھا ورنہ جماعت اسلامی کے ساتھ سفارت خانے کو چنداں دلچسپی نہیں لیکن بعد کے حالات سے یہ واضح ہوگیا کہ جماعت اور سفارت خانے کا گٹھ جوڑ ترقی پسند طلبار کی مخالفت تک محدود نہیں۔ گزشتہ مہینوں میں پیش آنے والے چند دلچسپ واقعات سے ہم "لیل و نہار" کے قارئین کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔

چندہ پیشگی مل گیا

امریکہ میں پاکستانی طلبار کی جماعت کو حکومت پاکستان ہر سال ۷۰۱ ۳ ڈالر (یعنی بونس بازار کے حساب سے ساڑھے پینتیس ہزار روپے) بطور امداد دیتی ہے۔ یہ روپیہ وزارت تعلیم کے چندے سے آتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طالب علمانہ سرگرمیوں کو فروغ دیا جائے۔ لیکن امسال مودودی جماعت کے جو افراد عہدیدار منتخب ہوئے ہیں ان میں طالب علم محض ایک شخص ہے، جو خزانچی مقرر ہوا ہے۔ باقی چار عہدیدار ملازمت پیشہ افراد ہیں۔ اسکے باوجود پاکستانی سفارت خانے کو حکومت پاکستان سے ان افراد کے لئے چندہ مانگتے ہیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی۔ نہ فقط یہ بلکہ اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کی گئی کہ اُن کو روپیہ بر وقت مل جائے۔ حکومت کا وظیفہ عام طور سے جنوری سے پہلے منظور نہیں ہوتا اور سفارت خانہ اسوقت تک طلبار کی جماعت کو روپیہ نہیں دیتا، جب تک کہ حکومت کی منظوری حاصل نہ ہو جائے۔ لیکن اس سال پاکستانی سفارتخانے نے حکومت کی منظوری سے پہلے ہی، اگست میں اپنے چندہ میں سے ۵۰۰ ڈالر جماعت کے کارکنوں کے حوالے کر دیئے تاکہ وہ ترقی پسند عناصر پر کیچڑ اچھالنے کے لئے اپنا رسالہ چھاپ سکیں۔

انجمن کا اجلاس سفارت خانے میں

حکومت کی مالی امداد اور سفارت خانے کی مداخلت کے باوجود پاکستانی طلبار کی جماعت کے عہدہ دار گزشتہ برسوں میں یہ ڈھونگ ضرور رچاتے تھے کہ ان کی تنظیم ایک آزاد جماعت ہے، لیکن امسال سفارتخانے اور جماعت اسلامی کا "باہمی تعاون" اسقدر مکمل ہے کہ اسمیں ڈھونگ رچانے کی بھی گنجائش نہیں۔ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انجمن کے عہدہ دار اپنا اجلاس سفارت خانے میں کریں۔ لیکن امسال عہدہ داروں کا پہلا اجلاس ۲۲ر اور ۲۳ر جولائی کو واشنگٹن میں سفارت خانے کی لائبریری میں ہوا جس میں سفارت خانے کے متعدد افسروں نے بھی شرکت کی۔

جماعتِ اسلامی جو کہ یہاں اپنے آپ کو پاکستانی عوام کے حقوق کا علمبردار ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ دراصل اپنا اصل کردار چھپا نہیں سکتی۔ اس کا ثبوت جماعت کے کارکنوں نے اسوقت بھی دیا جب انہوں نے صدر یحییٰ خان کو نیویارک میں ایک مراسلہ پیش کیا جس میں انہوں نے فوجی حکومت کی تعریف کی اور اس بات پر "تشویش" کا اظہار کیا کہ حکومت تخریب پسند عناصر کو کیوں برداشت کر رہی ہے۔

امریکہ میں پاکستانی سفارت خانے کی مطبوعات عام طور سے صدرِ پاکستان کے بیانات، تصویروں اور غیر ملکی مہمانوں کے دوروں کی خبروں سے بھری رہتی ہیں، ملک کے سیاسی اور معاشی حالات کا اُن سے کوئی پتہ نہیں چلتا۔ چونکہ سیاسی حالات کا اُن میں کوئی ذکر نہیں ہوتا لہٰذا طرف داری کی بھی کوئی گنجائش نہیں رہتی لیکن گذشتہ چند مہینوں میں سفارت خانے کے ترجمان "پاکستان افیرز" نے چند ایسی حرکتیں کی ہیں جس سے سفارت خانے اور جماعتِ اسلامی کے درمیان خفیہ معاہدہ کے متعلق شکوک کو تقویت پہنچتی ہے۔ جون ۳۰ء کے شمارے میں "پاکستان افیرز" نے قارئین کی اطلاع کے لئے مختلف سیاسی پارٹیوں کے پروگرام شائع کئے۔ بظاہر یہ مضمون "غیر جانبدار" تھا لیکن پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں یہ کوشش کی گئی تھی کہ جماعتِ اسلامی کو پاکستان کی سب سے ترقی پسند جماعت بتایا جائے۔

مثال کے طور پر اس مضمون میں بتایا گیا کہ جماعتِ اسلامی

(۱) سامراجیت کی ہر شکل میں اور دنیا کے ہر حصّہ میں مخالفت کرتی ہے۔

(۲) سیٹو اور سینٹو سے علیحدگی چاہتی ہے اور

(۳) استحصال کی ہر شکل کو جڑ سے اکھاڑنا چاہتی ہے۔" ہر سمجھدار شخص جانتا ہے کہ جماعت کی بنیاد ہی ان اصولوں کی مخالفت پر قائم ہے۔ پھر پاکستانی سفارت خانہ کیوں حقیقت کو جھٹلانا چاہتا ہے؟ جماعت اور سفارت خانے کے درمیان معاہدے پر اگر کوئی شک رہ گیا تھا تو اسکو "پاکستان افیرز" کے ۱۲ر نومبر کے شمارے نے دور کر دیا۔ سفارت خانے نے کراچی ایئرپورٹ کے واقعہ کو جس میں جماعت کے ایک کارکن نے پولینڈ کے نائب وزیر خارجہ کو قتل کر دیا محض ایک "ایکسیڈنٹ" قرار دیا جبکہ دنیا بھر کے اخبارات اور ریڈیو نے یہ خبر نشر کی کہ ملزم نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اس کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے اور اُس نے دانستہ طور پر پولینڈ کے وزیر کو کچلا۔

افسروں کی ہیرا پھیری

امریکہ میں پاکستانی سفارت خانے کی قابل اعتراض سرگرمیوں کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ سفارتخانے کا عملہ ایک ناانصافی اور ظلم کے نظام کی نمائندگی کرتا ہے اور اسکو اپنے فرائض پورا کرنے کے لئے جھوٹ، فریب اور دیگر مجرمانہ حرکتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ چونکہ دائیں بازو کے عناصر تاریخی حیثیت سے سماجی انصاف کے دشمن ہیں۔ ہمارا حکمران طبقہ ان کو بطور آلۂ کار استعمال کرتا ہے۔ اسکے علاوہ سفارت خانے کے کئی افراد نے ہیرا پھیری کر کے کافی ڈالر جمع کرلئے ہیں مثلاً "بلا ٹیکس" موٹر خریدنا اور پھر اسکو بازار کے

کھاؤ پر بیچ دینا یا پلجیم سے قالین منگوا کر دوسروں کو بیچنا وغیرہ یہ لوگ پاکستان واپس جاکر اس سرمائے سے چھوٹے موٹے سرمایہ دار بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایسے افسر ترقی پسند عناصر کو اپنا ذاتی دشمن بھی سمجھنے لگتے ہیں۔ امریکہ کا سیاسی ماحول جو نسلی تفریق، سامراجیت اور سرمایہ داری کے نظریات کی گندگی سے پُر ہے ان افسروں کے خود غرضانہ رجحانات کو تقویت پہنچاتا ہے۔

ہمارے سفارتخانے کے افسر اور امریکہ میں مُقیم اکثر پاکستانی، اپنے آپ کو دوراہے پر پاتے ہیں۔ ایک طرف تو انہوں نے امریکی معاشرے کی سودے بازی اور بازاریت کو اپنا لیا ہے اور دن رات چیزیں اکٹھی کرنے کی ہوس میں ڈوبے رہتے ہیں، دوسری طرف امریکی کلچر کو پوری طرح اپنانے میں ناکام ہونے کی وجہ سے اپنی ثقافتی انفرادیت" کا ڈھونگ رچانا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ عوامی کلچر سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے لے دے کے اُن کے پاس ایک ہی نعرہ رہ جاتا ہے۔ "اسلام زندگی کا مکمل قانون ہے اور پاکستان کا کلچر اسلام ہے۔" ڈالر کی لالچ میں وہ امریکہ کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتے اور یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ اُن کے بڑھتے ہوئے بچے امریکی طریقے سے ڈیٹنگ کریں اور ناچ پارٹیوں میں حصّہ لیں۔ اپنے اس تضاد کو سُلجھانے اور اولاد کو قابو میں رکھنے کے لئے وہ "اسلام" کا سہارا لینا چاہتے ہیں۔ اپنے ذاتی مفاد کو بچانے کے لئے امریکہ کی رجعت پسند سیاست کو اپنانا ضروری سمجھتے ہیں لیکن دراصل امریکی عوام کے لئے ان کے دلوں میں کوئی عزت نہیں۔

غرض یہ کہ سرمایہ پرستی، امریکی رجعت پسندی اور دائیں بازو کے "اسلام" کے اثر کے تحت پاکستانی سفارتخانے کے کئی افسر اپنے آپ کو نظریاتی طور پر مودودیت کے قریب پاتے ہیں اور مودودیت کی تبلیغ کرنے کے لئے اپنی سرکاری حیثیت کو استعمال کرتے ہیں۔ پاکستانی سفارتخانے کے ایسے افسروں میں فرسٹ سیکرٹری ظہیر فاروقی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ اس شخص نے نہ صرف پاکستانی طلباء میں پھوٹ ڈالنے اور اُن کی جماعت پر جماعتِ اسلامی کو مُسلّط کرنے میں نمایاں حصّہ لیا ہے بلکہ حال میں ایک جنسی ناول بھی چھاپا ہے جس کے مُطالعے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اودھ کی ہر مُسلمان عورت ایک طوائف تھی۔ پاکستانی سفارت خانہ بظاہر ہمارے کلچر کی نمائندگی کرتا ہے لیکن فاروقی صاحب نے تو "دہی دہلوی" کو بھی مات کر دیا۔

کیا حکومتِ پاکستان کو ان حالات کا علم نہیں؟ یا ترقی پسند عناصر کو دبانے کے لئے یہ سب کچھ جائز ہے۔ کیا ہم پیپلز پارٹی اور اسکے رہنما مسٹر ذوالفقار علی بھٹو سے یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ عوامی حکومت قائم ہونے کے بعد وہ امریکہ میں پاکستانی سفارت خانہ کی سرگرمیوں کی چھان بین کریں گے؟

وزیر نشریات کے ساتھ ریڈیو اسٹیشن بھی چپ ہو گیا

ایک کے ساتھ

دوسرے کا بھی

ناطقہ بند ہو گیا

ملتان کا ریڈیو اسٹیشن چلتے چلتے بند ہو گیا ہے۔ ابھی ایک ہی مہینہ پہلے اس کا افتتاح ہوا تھا۔ نشریات کے وزیر نوابزادہ شیر علی خاں نے تقریبِ افتتاح کی آخری رسوم اپنے ہاتھ سے انجام دی تھیں لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ ساعت بُری تھی اب نہ وزیر نشریات رہے نہ وہ ریڈیو اسٹیشن رہا۔ ایک کی نحوست دوسرے کو کھا گئی۔

الف لیلہ میں ایک دیو کا قصّہ آتا ہے۔ اس دیو کی جان طوطے میں تھی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ملتان کے ریڈیو اسٹیشن کی جان بھی وزارتِ نشریات کے طوطے میں تھی۔ جب تک طوطا ٹیں ٹیں کرتا تھا، ریڈیو اسٹیشن بھی ٹن ٹن بولتا تھا پھر بقول شاعر

طوطا ہمارا مر گیا کیا بولتا ہوا

اُدھر وہ خاموش ہوا، اِدھر ریڈیو اسٹیشن کو بھی چُپ لگ گئی۔ ویسے تو یہ ٹھیک ہے کہ شیر علی خاں جب تک وزیر رہے، ریڈیو ٹی وی اور مقبوضہ اخبارات ان ہی کی بولی بولتے تھے، لیکن ملتان کا ریڈیو اسٹیشن تو واقعی ان کا نفسِ ناطقہ ثابت ہوا کہ ایک کے ساتھ دوسرے کا بھی ناطقہ بند ہو گیا۔ معلوم نہیں شیر علی خاں نے اس ریڈیو اسٹیشن میں کون سا پیچ چھپا کر رکھا تھا، کہ وزارت سے باہر نکلتے ہی گھما دیا اور واپس لاہور آ گئے، بالکل اسی روایتی بڑی بی کی طرح جو اپنا مُرغ بغل میں داب کر اس اعتماد کے ساتھ گاؤں سے باہر نکل گئی تھیں کہ اب نہ مُرغ بولے گا، نہ صُبح ہوگی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ بھی وزیر نشریات کا حُسنِ انتظام تھا۔ اِدھر وہ "سابق" ہوئے اِدھر، ان کے دورِ وزارت کا ریڈیو اسٹیشن بھی "سابق" ہو گیا۔ وزیر نشریات نے اس کے اندر ضرور کوئی اچھی قسم کا بیٹری سیل ڈلوایا ہو گا، جو ایک مہینہ چل گیا، ورنہ آج کل جو بیٹری سیل بازار میں آتے ہیں، وہ تو ٹارچ میں اور کھلونوں میں چار دن بھی نہیں چلتے۔

سُنا ہے ریڈیو ملتان کا عملہ شہر میں موٹر ڈھونڈتا پھرتا ہے، تاکہ ریڈیو کے کل پُرزوں کو چلایا جا سکے۔ چلانے سے مراد، ان کی اگر یہ ہے کہ اُسے موٹر کار میں ڈال کر تماشائی کے لئے شہر میں اِدھر اُدھر چلایا جائے، پھر تو اور بات ہے، لیکن مقصد اگر یہ ہے کہ ریڈیو کا کارخانہ ویسے تو وہیں رہے، جہاں اُسے جمایا گیا ہے، البتّہ اسکی کارکردگی بحال ہو جائے تو اس کا کچھ اور بندوبست کرنا ہو گا۔

کہا جاتا ہے کہ اس ریڈیو اسٹیشن کی تعمیر میں ایک کروڑ روپے خرچ ہوئے ہیں۔ اس ایک کروڑ روپے میں کچھ مشینیں اور کل پُرزے بھی خریدے گئے ہوں گے۔ اور جو رقم بچی وہ رسمِ افتتاح میں کام آ گئی ہو گی۔ وزیر نشریات اُن دنوں ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے، ملک میں اُن کے نام کا ڈنکا بجتا تھا، ظاہر ہے کہ اتنی بڑی تقریب کا افتتاح بھی سُوکھے مُنہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن افسوس ہے کہ کارندوں نے پیش بندی سے کام نہ لیا اگر تھوڑی سی رقم بچا رکھتے، تو آج شہر میں موٹر تلاش کرتے نہ پھرتے۔ ریڈیو اسٹیشن کے لئے فرنیچر، قالین، گاؤ تکیے، ڈھولکی، شہنائی، جھانجھ مجیرے سبھی کچھ خریدا گیا ہو گا۔ لگے ہاتھوں ایک موٹر فالتو خرید کے رکھ لیتے تو آڑے وقت میں کام آتی۔

*

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ریڈیو ملتان کی رسمِ افتتاح میں وزیر نشریات نے عُجلت سے کام لیا۔ مشینوں اور کل پُرزوں کی تنصیب کے بعد ایک مناسب وقفہ ان کی آزمائش اور جانچ پڑتال کے لئے بھی چاہیئے۔ لیکن وزیر نشریات کے پاس وقت بہت کم تھا۔ انتخابات قریب آ پہنچے تھے اور اُن کا یہ اندیشہ بھی ٹھیک ہی تھا کہ اس کے بعد کہیں کوئی نئی حکومت نہ بن جائے اور وہ بیچارے رسمِ افتتاح سے بھی رہ جائیں۔ ہاں اگر ان کی موجودگی میں ریڈیو اسٹیشن چل نکلا تو یہ ان کے دورِ وزارت کا ایک کارنامہ شمار ہو گا۔ لہٰذا، وزیر صاحب اپنا سا "کارنامہ" کر گزرے۔ اب اسٹیشن کام کرتا ہے یا نہیں کرتا، ان کی بلا سے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ کسی اسکول کی رسمِ افتتاح میں فوٹو گرافر کو کہیں اور جانے کی عجلت تھی، لہٰذا مہمانِ خصوصی نے فوٹو گرافر کی دلدہی کے لئے باقی رسمیں تو ملتوی کر دیں، البتہ فیتہ کاٹتے ہوئے اپنی تصویر کھنچوا لی، خطبہ بعد میں پڑھا اور دوسرے تکلفات بھی بعد ہی میں ادا کیے۔ اگرچہ تصویر کھینچ جانے کے بعد ان رسموں کا کوئی جواز باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وزیر اطلاعات کو بھی فیتہ کاٹنے کی جلدی تھی۔ انھوں نے اپنا کام کر لیا، بعد میں جو ہوتا ہے، ہوتا رہے۔

عبدالرؤف عروج

ہوجالو

ہوجالو سندھ کے دیہات کا ایک رزمیہ گیت ہے۔ فتحمندی کے بعد جب رن سے مرد واپس آتے ہیں تو دیہات کی دوشیزائیں اور عورتیں ہوجالو گا کر ان کا استقبال کرتی ہیں اور ان کی ظفر مندی پر اظہار مسرت کرتی ہیں ہوجالو گانے کا ایک خاص طریقہ ہے۔ عورتیں اور لڑکیاں ایک دائرہ بنا لیتی ہیں اور ہوجالو کی خاص دھن میں جس سے اب سب واقف ہو چکے ہیں کوئی ایک عورت پہلا مصرعہ یا شعر گاتی ہے دوسری عورتیں اور لڑکیاں اسی مصرعے یا شعر کو دہراتی ہیں اور ہر تان ہوجالو پر توڑی جاتی ہے سندھی کا یہ رزمیہ گیت بہت قدیم اور عوامی گیت ہے۔ دوسرے قدیم عوامی گیتوں کی طرح اس کے خالق کا بھی سراغ نہیں ملتا۔ اس کا مقبول ترین اور آخری مصرعہ یہ ہے۔

سنجو کھٹی آیو خیر سان ہوجالو یعنی میرا فاتح فتح مندی کے ساتھ آیا، ہوجالو

سندھ کے شاعر نیاز ہمایونی نے تین ہوجالو سندھی میں لکھے ہیں جو ہلال پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان گیتوں کی تخلیق کا محرک موجودہ الیکشن ہے اور ان میں رجعت پسندوں پر سخت طنز کیا گیا ہے اس الیکشن میں رجعت پسندوں نے فرضی اور کھوکھلے نعرے لگا کر ترقی پسندوں کی بے پناہ یلغار کو روکنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ شاعر نے ہوجالو میں اس کا بھی ذکر کیا ہے۔

اردو زبان کا اولین ہوجالو خوش فکر شاعر عبدالرؤف عروج نے لکھا ہے۔

(ادارہ ان معلومات کے لئے پیر حسام الدین راشدی صاحب، کا ممنون ہے)۔

○

ہم خسروشِ بے کراں
ہم عتابِ بے اماں،
ہم نے اُلٹے آسمان
ہم جوان و دل جواں
ـــــــ ہوجالو

انجمن در انجمن،
ہم بہاروں کی پھبن
ہم اجالوں کا چلن
ہم سے صحرا، گلستاں
ـــــــ ہوجالو

اک چراغِ طور ہم
روشنی ہم، نور ہم
وقت کا منشور ہم
ہم بپھرتی آندھیاں
ـــــــ ہوجالو

کاٹ میں تلوار ہے
موج میں یلغار ہے۔
زندگی بیدار ہے
کارواں در کارواں
ـــــــ ہوجالو

ظالموں کے یار وہ
قوم کے غدار وہ
ہیں کدھر بٹ مار وہ
کیا ہوئیں سرداریاں
ـــــــ ہوجالو

یہ کسانوں کی زمین
یہ صداقت کی امین
رہ نہ جائے اب کہیں
ظلم کا نام و نشان
ـــــــ ہوجالو

جاگ اٹھی روحِ بشر
کارخانے سر بسر
نعرۂ فتح و ظفر
نغمۂ سیلِ رواں
ـــــــ ہوجالو

لائقِ صد غور ہے۔
یہ زمانہ اور ہے۔
محنتوں کا دَور ہے
کیسی تالہ بندیاں
ـــــــ ہوجالو

وقت کے ہر موڑ پر
ظلم کی لوٹی کمر
رجعتوں کو روند کر
کھٹی آیو خیر سان
ـــــــ ہوجالو

مُبصّر

مصر میں سوشلسٹ نظامِ معیشت پر ایک نظر

یہ خطّۂ عرب دنیا کے لئے انقلاب کی تجربہ گاہ ہے

مصر میں جمال عبدالناصر اور اُن کے ہمنوا نوجوان فوجی افسر اس نتیجہ پر پہنچے کہ عرب اس وقت صیہونیت سے آزادی نہیں حاصل کرسکیں گے جب تک اندرونِ مُلک میں استعمار کے ایجنٹ یعنی شاہ پرست عناصر کا قلع قمع نہ کردیا جائے۔ اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ مُلک میں شہنشائیت کے ستون یعنی جاگیرداری اور سرمایہ داری کا بھی خاتمہ کردیا جائے۔ ناصر نے اپنی کتاب فلسفۂ انقلاب میں لکھا ہے کہ ہر قوم پہلے سیاسی اور بعدازاں سماجی انقلاب سے گذرتی ہے! اور مصر بیک وقت سیاسی وسماجی انقلاب سے دوچار ہے۔ ہر قوم سیاسی آزادی حاصل کرنے کے بعد سماجی انصاف کے قیام کے لئے جدوجہد کرتی ہے جو طبقاتی جنگ کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ زغلول پاشا کی قیادت میں مصر میں ۱۹۱۹ء میں ایک انقلاب برپا ہوا لیکن یہ تحریک محض سیاسی ہوکر رہ گئی۔ انقلاب کے لیڈروں نے ملک کے سماجی اور معاشی ڈھانچے میں بُنیادی تبدیلی پیدا کرنے کی مطلق ضرورت نہ سمجھی جس کے باعث انقلاب ناکام ہوگیا۔

مصر کی تاریخ پر جمال عبدالناصر کی گہری نظر تھی! انہوں نے زغلول پاشا کی طرح محض سیاسی انقلاب پر قناعت نہ کی بلکہ اسے سماجی عدل کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ ناصر اور اسکے ہمنوا نظریاتی سوشلسٹ نہ تھے بلکہ وہ سب جاگیرداری کے استیصال پر متفق تھے۔ کیونکہ مصر کے بڑے بڑے جاگیردار مُلک کی سیاست پر حاوی تھے اور اپنے اثر ورسوخ سے نام نہاد پارلیمنٹ کو زرعی و دیگر معاشی اصلاحات نہ کرنے دیتے تھے۔ لہٰذا یہ ضروری ہوگیا کہ عوام کو جاگیرداروں کے شکنجے سے آزاد کرایا جائے تاکہ وہ مُلک کی سیاست میں حصّہ لے سکیں۔ ۱۹۴۸ء میں وفد پارٹی نے برائے نام زرعی اصلاحات کی تھیں جن کی رو سے حکومت کی کچھ زمین ایک ہزار فلاحین یعنی کاشتکاروں میں تقسیم کردی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ اصلاحات ناکافی تھیں کیونکہ ان سے جملہ آراضی کی تقسیم میں کوئی فرق نہ آیا اور جاگیردارانہ نظام مُلک پر مسلّط رہا۔

مصر میں جاگیرداری کی تاریخ بڑی قدیم ہے۔ دراصل اس نظام کے بانی فراعنۂ مصر تھے جنہوں نے ملک کی ساری آراضی کو اپنی ملکیت قرار دینے کے بعد مذہبی پیشواؤں فوجی افسروں اور شاہی خاندان کے افراد اور مصاحبوں کو زمین کی شکل میں عطیات دیئے۔ سترھویں صدی کے آغاز میں ترکوں نے التزام کا طریقہ رائج کیا۔ اس نظام کے تحت زمین چند لوگوں کو دے دی جاتی تھی تاکہ وہ رعیت سے محصول وصول کر کے سُلطان کو دیں۔ یہ لوگ ملتزم کہلاتے تھے اور حکومت کے اہم ستون ہوا کرتے تھے۔ انیسویں صدی میں محمد علی پاشا نے اس نظام کو ختم کرکے آراضی کی ازسرِنو تقسیم کی۔ کاشتکاروں کو پانچ یا چھ ایکڑ کے قطعات کاشت کے لئے دیدیئے جاتے تھے لیکن محمد علی نے بڑے بڑے قطعات اپنے خاندان کے افراد اور اعلیٰ فوجی اور سول افسروں کو بطور جاگیر دے دیئے۔ گو زمین کی ملکیت حکومت کو حاصل تھی لیکن کاشتکار زمین سے مستفید ہوسکتا تھا۔ یہ نظام اُنیسویں صدی کے آخر تک باقی رہا۔ انگریزوں کے قبضہ کے بعد قابلِ کاشت آراضی میں اضافہ ہوا اور آب رسانی کا انتظام بھی کچھ بہتر ہوگیا۔ ان تمام اصلاحات کے باوجود کاشتکار کی حالت بہتر نہ ہوسکی۔ ۱۹۴۷ء میں دیہی آبادی کی فی کس آمدنی تقریباً وہی تھی جو پچاس سال قبل تھی!

پرانا زرعی نظام

یہ ہے مصر میں جاگیرداری کی مختصر "تاریخ — ہمیں فرعون، ترک، مملوک، محمد علی اور برطانیہ کی زرعی پالیسیوں میں ایک قدر مشترک نظر آتی ہے اور وہ ہے جاگیرداری نظام۔ اس نظام کی بنیاد تمام زرعی آراضی پر چند افراد کی اجارہ داری ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کاشتکار مالکانہ حقوق سے محروم ہوجاتے ہیں اور انکی محنت کا ثمر جاگیردار غصب کرلیتا ہے۔ چنانچہ چند مٹھی بھر جاگیردار ملک کے زرعی وسائل پر قابض ہوجاتے ہیں۔ اور یہی لوگ شہنشاہیت کے حامی ہوتے ہیں۔ یہ عناصر مُلک میں عوامی جدوجہد کے ذریعہ اُنقلابی تبدیلی نہیں لانے دیتے، چنانچہ عوام مجبور ہوکر ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ عوام کے اس سیلاب کو روکنے کے لئے شاہ پرست، جاگیردار، سرمایہ دار کبھی تو سنگینوں کا سہارا لیتے ہیں اور کبھی ملّاؤں کے فتووں کا۔ مصر میں انقلاب کے وقت دو لاکھ دو ہزار فلاحین ایک فدان (ایک ایکڑ سے کچھ زیادہ) سے کم آراضی کے مالک تھے۔ یعنی ملک کے ۷۰ فیصدی کاشتکاروں کے پاس صرف ۱۳ فیصد قابلِ کاشت آراضی تھی اور ۸۰ لاکھ باشندوں کے پاس بالکل زمین نہ تھی وہ بٹائی یا مزدوری پر گذراوقات کیا کرتے تھے۔ اس کے برعکس شاہی خاندان کے افراد کے پاس پونے دو لاکھ فدان زمین تھی اور ۲۸۰ افراد کے پاس ۵ لاکھ ۸۵ ہزار فدان زمین تھی۔ کیا یہ کسی اعتبار سے منصفانہ تقسیم ہے؟ اس کے علاوہ لگان کی رقم میں دن دونا رات چوگنا اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۲ء میں ایک ایکڑ پر ۳۰ مصری پونڈ لگان ادا کرنی پڑتی تھی جو تقریباً کل پیداوار کا نصف تھی۔ ۱۹۵۳ء میں ایک کاشتکار کی سالانہ آمدنی تخمیناً ۴۳ مصری پونڈ تھی جبکہ یورپ میں ۱۹۰ مصری پونڈ فی کس تھی۔ اس سے بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ملک کے عوام کا معیارِ زندگی کس قدر پست رہا ہوگا۔ وہ زندگی کی بُنیادی ضرورتوں یعنی خوراک، پوشاک، رہائش، تعلیم و طبّی سہولتوں سے یکسر محروم تھے۔ اپنی پس ماندگی اور غربت کے باعث مصر کے کاشتکار نہ تو ٹریکٹر خرید سکتے تھے، نہ ہی پاتال توڑ کنویں بنا سکتے تھے۔ اور نہ انکی قوتِ خرید اس کی اجازت دیتی تھی کہ وہ نئی آراضی خرید کر کاشت میں اضافہ کرسکیں۔ مصر کے باشندے جو زمانۂ قدیم میں فنِ تعمیر، مجسمہ سازی، مصوّری، پارچہ بافی، کڑھائی اور دیگر دستکاری کے لئے تمام دُنیا میں مشہور تھے۔ اپنی پس ماندگی کے باعث بے ہنر ہوگئے تھے۔ وہ نہ تو اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ سکتے تھے اور نہ آنے والی نسلوں کے مستقبل کو سنوار سکتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی غلامی کو نوشتہ تقدیر سمجھ کر سرِ تسلیم خم کرچکے ہیں۔

نئی حکومت کے انقلابی فیصلے

مصر کی انقلابی حکومت نے اس فرسودہ نظام کو پاش پاش کرڈالا۔ میجر جمال سلیم کی سرکردگی میں ماہرین اقتصادیات احمد فواد اور راشد البراوی نے زرعی اصلاحات کا قانونی مسودہ تیار کیا جسے فوجی حکومت نے ۹ ستمبر ۱۹۵۲ء کو نافذ کردیا۔ اس قانون کے تحت زمین کی ملکیت کی حد ۲۰۰ فدان قرار پائی۔ اس کے علاوہ زمین کے مالک کو یہ حق بھی دیا گیا کہ وہ اپنے دو لڑکوں کے نام پچاس پچاس فدان زمین منتقل،

سو فدان زمین پر حد مقرر کر دی گئی۔ تمام بنک اور انشورنس کمپنیاں حکومت کی تحویل میں لے لی گئیں۔ تمام درآمدی اور بیشتر برآمدی تجارت حکومت نے براہِ راست اپنی تحویل میں لے لی مزدوروں کے لئے سات گھنٹے یومیہ کام مقرر ہوا اور طے پایا کہ منافع کی ایک چوتھائی رقم مزدوروں میں تقسیم کر دی جائیگی

کر سکتا ہے۔ اس طرح ایک کنبہ جو عموماً آٹھ افراد پر مشتمل ہوتا ہے ۳۰۰ فدان سے زائد زمین نہیں رکھ سکتا۔ لیکن جولائی ۶۱ء کی ترمیم کے بعد سے ایک کنبہ کے لئے زمین کی حد ملکیت ۱۰۰ فدان مقرر کر دی گئی۔ یہ قانون بڑا منصفانہ تھا۔ اس لئے زمین کے سابقہ مالکان کو معقول معاوضہ دیا نیز انہیں چھ ہفتہ کی مہلت دی تاکہ وہ اس وقفہ میں اپنی زائد زمین حکومت کے مقرر کردہ نرخ پر یعنی زمین کے محصول کے ستر گنے دام پر کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ پانچ فدان کے قطعات میں ان کاشتکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیں جو ان زمینوں پر کاشت کر رہے تھے یا اس پر یا اس کے قرب و جوار میں سکونت پذیر تھے۔ اس طرح ڈیڑھ لاکھ فدان زمین کاشت کاروں کے ہاتھ فروخت کر دی گئی۔ یہ خرید و فروخت ۳۱ اکتوبر ۵۳ء کے بعد ممنوع قرار دے دی گئی تھی لیکن جولائی ۶۱ء کے قانون نے اس کی مدت میں ۱۹۷۰ء تک توسیع کر دی۔

زمینوں پر سرکاری قبضہ

شاہ فاروق اور شاہی خاندان کے دو سو افراد کی ملکیت جو پونے دو لاکھ فدان تھی بلا معاوضہ ضبط کر لی گئی۔ یہ آراضی ۲۳ اگست ۱۹۵۳ء کو ۱۶۴ فلاحین میں تقسیم کر دی گئی۔ شاہ فاروق کی زمینوں پر کاشتکار کی حیثیت غلام سے بہتر نہ تھی اور اس کا کنبہ ۲۰ پونڈ سالانہ آمدنی پر گذر اوقات کرتا تھا! ان کے علاوہ زرعی اصلاحات سے متاثرہ تمام مالکان زمین کو حکومت نے انکی املاک کی دس گنی قیمت ۳ فیصد سالانہ شرح سود کے اعتبار سے تیس سال میں واجب الادا ہونے والے بانڈ کی شکل میں بطور معاوضہ ادا کرنے کا اعلان کیا اور اس پر فوراً عمل درآمد شروع ہو گیا۔ لیکن ۱۹۶۱ء کے قانون کے مطابق معاوضہ چار فیصد سالانہ شرح سود پر پندرہ سال کی مدت میں بانڈ کی شکل میں واجب الادا ہوگا۔ ۱۹۶۲ء میں حکومت نے غیر ملکی باشندوں کی زمینوں کو معاوضہ کی شرط پر اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس طرح حکومت مزید ڈیڑھ لاکھ فدان زمین کاشتکاروں میں تقسیم کر کے ملک کے ڈھائی لاکھ گھرانوں کو فائدہ پہنچا سکی۔ زمینوں کے انتظام کے لئے حکومت نے ایک خود مختار ادارہ زرعی اصلاحی کمیٹی بھی قائم کیا۔

اس کے علاوہ ۱۹۵۲ء کے زرعی اصلاحات کی دفعہ ۳۳ کے تحت لگان میں تخفیف کر دی گئی۔ جو زمین کے ٹیکس کی سات گنی حد سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ اس طرح کاشتکاروں کی آمدنی میں پچاس فیصد اضافہ ہوا۔ اب کاشتکاروں کو آسانی سے بیدخل نہیں کیا جا سکتا۔ اب تمام آراضی کا تحریری پٹہ ہوگا جس کی کم از کم مدت تین سال ہوگی۔ ۱۹۵۲ء میں تمام پٹوں کی مدت میں ایک سال کا اضافہ کر دیا گیا۔ اور اس کے بعد اس کی مدت میں تین تین سال کے لئے دوبارہ زیر کاشت آراضی کے نصف رقبہ پر توسیع ممکن ہوگی۔ کھیت پر کام کرنے والے مزدوروں کی کم سے کم اُجرت کا تعین کیا گیا۔ مردوں کی شرح مزدوری ۳ شلنگ یومیہ اور عورتوں کی ایک شلنگ دس پنس مقرر کی گئی۔

اراضی کی از سرِ نو تقسیم

اب زمین کی تقسیم منصفانہ ہے۔ کوئی کنبہ سو فدان یعنی ۱۰۵ ایکڑ زمین سے زیادہ نہیں رکھ سکتا۔ اب عموماً متوسط درجہ کے کاشتکاروں کے پاس فی کس پندرہ تا بیس فدان زمین ہے ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے زرعی پیداوار میں اضافہ ضروری ہو گیا ہے۔ لہٰذا حکومت نے مشینی زراعت کا طریقہ رائج کیا ہے اس غرض سے کواپریٹو سوسائٹیاں قائم کی گئی ہیں جو کسانوں کو کھیتی کے نئے طریقے سکھاتی ہیں انہیں بیج کھاد زرعی مشینیں فراہم کرتی ہیں اور ان کی پیداوار کو بازار میں مقررہ نرخ پر فروخت کر کے اپنے اخراجات نکالنے کے بعد ہر کسان کو بقدر ملکیت اس کا حصہ دیدیتی ہیں، کچھ رقم سوسائٹی کے بنک میں محفوظ رہتی ہے جو آڑے وقتوں میں کسانوں کے کام آتی ہے یہ سوسائٹیاں چیدہ چیدہ خطوں میں حکومت کی طرف سے قائم کی گئی ہیں ان سوسائٹیوں میں ہر کسان کی شمولیت لازمی ہے۔ مشینی زراعت کے سوسائٹی نے چک بندی کا طریقہ رائج کیا جو کئی کئی سو ایکڑ زمین پر مشتمل ہے ہر چک کی نگرانی متعلقہ سوسائٹی کے ذمہ ہوتی ہے اس میں حکومت کے دو نمائندے ہوتے ہیں جن میں سے ایک زرعی ماہر ہوتا ہے جو سوسائٹی کے بورڈ کا مشیر ہوتا ہے بورڈ کا انتخاب سوسائٹی کے ممبر کرتے ہیں سوسائٹی کے بورڈ کا مشیر ہوتا ہے بورڈ کا انتخاب سوسائٹی کے ممبر کرتے ہیں سوسائٹی فصلوں کی کاشت کا تعین کرتی ہے تاکہ زرعی پیداوار ملک کی ضروریات کے مطابق ہو۔ اس طرح ایک حصہ کپاس کی کاشت کے لئے مخصوص ہے، دوسرا چاول یا مکئی اور تیسرا گندم کے لئے۔ اور ہر ممبر کو تینوں فصلوں میں سے ایک ایک حصہ ملتا ہے۔ اس طرح ہر دو سال میں تین تین فصلیں ہو جاتی ہیں جس سے ملک کی پیداوار میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔

زرعی سوسائٹیاں قائم کر دی گئیں

اس تجربہ سے معلوم ہوا کہ ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۹ء کے درمیان سرکاری سوسائٹیوں نے ملک کی پیداوار میں ۴۵ فیصد اضافہ کیا جبکہ دوسری سوسائٹیاں صرف ۱۵ فیصد اضافہ کر سکیں۔ اسی وجہ سے ۶۰ء میں حکومت نے فیصلہ کیا کہ اب تمام زرعی علاقوں میں سرکاری سوسائٹیوں کی توسیع کر دی جائے گی۔ اس سے کچھ نادان لوگ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ سرکاری سوسائٹیاں کسانوں پر پابندی عائد کر دیتی ہیں اور ان کی آزادی سلب کر کے ان کی پیداوار غصب کر لیتی ہیں! یہ حضرات یا تو اس نظام کو سمجھ ہی نہیں سکے یا دیدہ دانستہ حقائق پر پردہ پوشی کرتے ہیں۔ وہ زرعی منصوبہ بندی کے نظام کو سمجھ ہی نہیں سکے یا دیدہ دانستہ حقائق پر پردہ پوشی کرتے ہیں۔ وہ زرعی منصوبہ بندی کے لوازمات سمجھنے سے مطلقاً قاصر ہیں۔ یہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر زرعی اور صنعتی پیداوار کو چند افراد کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تو ملک کی معیشت پر ان کی اجارہ داری قائم ہو جائے گی اور یہ لوگ ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری کے ذریعہ عوام کا استحصال کرتے رہیں گے۔ امریکہ نے جو آزاد معیشت کا ڈھونگ رچائے ہوئے ہے اپنے کسانوں پر سخت زرعی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ امریکی حکومت قانون کے ذریعہ کسانوں کے لئے فصلوں کی کاشت اور ان کی پیداوار کی قیمت فروخت کا بھی تعین کرتی ہے۔ اسکے جواز میں امریکی پروپیگنڈہ یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ یہ اقدامات کسانوں کی بہتری کے لئے کئے جاتے ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر مصر یا دیگر افرو ایشیائی ملک اپنی معیشت کو بہتر بنانے کے لئے اصلاحات نافذ کرتے ہیں تو ان پر کیوں نکتہ چینی کی جاتی ہے۔

یہ سوسائٹیاں مصر کی وزارتِ امورِ معاشرتی اور زراعت کی زیرِ نگرانی ہیں۔ اسکے علاوہ دیہی علاقوں میں

حکومت، قومی اسمبلی کا ۲۰ فی صد تعلیم پر خرچ کرتی ہے

سوشل مرکز کھولے گئے ہیں جہاں تعلیم، حفظانِ صحت، معاشرتی و زرعی امور سے متعلق مختلف شعبے کام کر رہے ہیں۔ اِن اداروں میں تربیت یافتہ ٹیچر، ڈاکٹر اور نرسیں کام کر رہی ہیں۔ سرکاری سوسائٹیاں اپنے منافع کی رقم رفاہِ عام پر صرف کرتی ہیں اور اپنے علاقوں میں متعدد مساجد، اسکول، شفاخانے تعمیر کئے ہیں۔ ہر مرکز میں ایک ٹیلیویژن سیٹ ہوتا ہے۔

تعلیم اور علوم کو فروغ ملا

انقلابی حکومت نے مصر کے بنجر اور ریگستانی خطّوں کو زیرِ کاشت لانے کے لئے اسوان بند اور دوسرے ترقیاتی منصوبوں پر عملدرآمد کر دیا ہے۔ اسوان بند سوویت رُوس کی مالی اور فنی امداد سے پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ اسکے ذریعہ تقریباً ایک کروڑ فدان زمین زیرِ کاشت لائی جاسکے گی۔ اسکے علاوہ فیوّم کے نخلستان اور اسکندریہ کے قریب اور مشرقی ڈیلٹا میں کافی زمین قابلِ کاشت لائی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ خارجہ اور داخلہ دو جنوبی نخلستانوں میں دو سو ٹیوب کنوئیں کھودے گئے ہیں جن سے تقریباً چھ لاکھ فدان زمین سیراب ہوسکتی ہے۔ اس طرح لکھوکھا انسانوں کو اِن علاقوں میں آباد کیا جاسکتا ہے اور مُلک کی زرعی پیداوار میں معتدبہ اضافہ ہوسکتا ہے۔

مصر کی انقلابی حکومت نے تعلیم پر بڑی توجہ دی ہے اب تک تعلیم محض اُمراء و رؤسا کے بچوں تک محدُود تھی اور مُلک کی ہمہ گیر اکثریت جہالت اور ناخواندگی کے قعرِ مذلت میں پڑی ہوئی تھی۔ شاہ پرست حکومتوں نے عوام کو قصداً تعلیم سے اس لئے محرُوم رکھا کہ ان کا سیاسی شعور بیدار نہ ہوسکے۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء کی مردم شماری کے اعتبار سے ملک میں ۸۲ فیصدی افراد بالکل ناخواندہ تھے، ۵۲ء تک بھی خواندگی میں کوئی خاص اضافہ نہ ہوسکا۔ کیونکہ اس وقت بھی ۷۷ فی صدی لوگ ناخواندہ تھے۔ لیکن چند ہی سال کے اندر ناصر حکومت نے خواندگی میں بڑا اضافہ کیا۔ مثال کے طور پر ۱۹۵۲ء میں صرف ۴۵ فیصد بچے پرائمری اسکولوں میں جاتے تھے۔ لیکن ۱۹۶۰ء میں ان کی تعداد ۷۵ فی صد ہوگئی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اب تقریباً تمام بچے اسکول جانے لگے ہیں۔ حکومت نے اسکولوں کی تعداد میں اضافہ کیا، نصابِ تعلیم میں تبدیلیاں پیدا کیں۔ فنی مدارس قائم کئے۔ اسکولوں میں ثانوی درجہ تک مفت تعلیم دی جاتی ہے اور بچوں کو دودھ اور خوراک فراہم کی جاتی ہے۔ حکومت نے ۳۰۰ غیر ملکی اسکولوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ لہٰذا اب تمام اسکولوں کے معیار میں یکسانیت پیدا کر دی گئی ہے۔ اب غریب اور امیر بچوں کے لئے الگ الگ اسکول نہیں رہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ اساتذہ معقول تنخواہوں پر مامور کئے جاتے ہیں۔ متعدد یونیورسٹیاں قائم کی گئی ہیں اور ان کی فیسیں برائے نام ہیں۔ جن سے ہر باصلاحیت اور علم دوست نوجوان مستفید ہوسکتا ہے۔ طلبا کی نصف تعداد ایسی ہے جو حکومت کے وظیفوں پر تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مصر کے بے شمار طلباء غیر ممالک کی یونیورسٹیوں میں مختلف علوم و فنون میں اعلےٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ حکومت تقریباً قومی بجٹ کا ۲۰ فی صد حصہ تعلیم پر صرف کرتی ہے، اور اس میں مزید اضافہ کرتی جارہی ہے۔ دینیات اور مذہبی علوم و تحقیقات پر حکومت نے خاص توجہ کی ہے اور ان اداروں سے پہلے کی بہ نسبت زیادہ علماء فارغ التحصیل ہوکر نکلتے ہیں۔ یہ علما دینی علوم کے علاوہ جدید علوم بھی حاصل کر رہے ہیں۔ اب کسان اور مزدور کے لڑکے فارغ التحصیل ہوکر وکیل، ڈاکٹر، انجنیئر، سول اور فوجی افسر اور عالم دین بن کر قوم کی خدمت کر رہے ہیں اس سے قبل مصر کے کاشتکاروں اور مزدوروں کے سامنے علم و فن اور ترقی کی راہیں بالکل مسدود تھیں۔ لیکن اب سوشلسٹ نظام نے انہیں اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ترقی کرنے کا موقع دیا ہے۔

بعث تحریک کا نعرہ

مصر کا سوشلسٹ نظام کسی سوچے سمجھے نظریاتی منصوبے کا نتیجہ نہ تھا اور نہ اسے کسی بیرونی طاقت نے ملک پر مسلط کیا۔ گو ۱۹۵۶ء تک جنرل ناصر اپنے معاشی پروگرام کے لئے سوشلزم کی بجائے سماجی عدل کی اصطلاح استعمال کرتا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقتصادی عوامل اور مغربی استعمار کی پالیسی نے مصر کی تاریخ کے بہاؤ کو اشتراکیت کی طرف موڑ دیا۔

یوں تو دنیائے عرب کے دانشور سوشلزم کی تحریک سے واقف ہوچکے تھے، چنانچہ شام کا شبلی شمیل (۱۸۶۸ء-۱۹۱۷ء) اور مصر کے سلامہ موسیٰ (۱۸۸۷-۱۹۵۹ء) نے فرانسیسی و فیبین یعنی برطانوی طرز کی اشتراکیت کی اشاعت کی لیکن یہ عوامی تحریک کی شکل نہ اختیار کرسکی۔ شام کی بعث تحریک نے عرب قومیت اور سوشلزم کا نعرہ لگایا اور اس نظریہ کو دانشوروں میں مقبول کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۵۶ء میں شام میں بعث تحریک کے رہنماؤں نے حکومت میں شمولیت بھی کی اور ان کی سعی سے فروری ۱۹۵۸ء میں مصر اور شام کا اتحاد وجود میں آیا جو ۲۸ ستمبر ۶۱ء کو مقامی سرمایہ داروں اور صیہونیت نواز، امریکی و برطانوی استعمار کی سازش سے ناکام ہوگیا۔ لیکن اس کے باوجود بعث پارٹی ہنوز اتحاد کی خواہاں ہے ۶۳ء میں اسنے شام و عراق میں اقتدار حاصل کر لیا۔ اور نومبر ۷۰ء میں شام نے دوبارہ مصر سوڈان اور لیبیا کے ساتھ وفاق میں اپنی شمولیت کا اعلان کر دیا۔ لیکن نصب العین پر اتفاق کرتے ہوئے بھی طریقۂ کار اور غالباً عرب دُنیا کی قیادت کی رقابت نے ناصر اور بعث کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی جو آج تک پُر نہ ہوسکی (لیل و نہار کے ایک پچھلے شمارے میں بعث تحریک پر مفصل تبصرہ کیا جاچکا ہے)۔

سوشلزم کا واحد راستہ

جب اسرائیل نے ۵۵ میں غازہ پر حملہ کیا تو مصری حکومت نے امریکہ اور برطانیہ سے اسلحہ خریدنے کی درخواست کی جو اس لئے مسترد کر دی گئی کہ مصر نے میثاق بغداد میں شمولیت سے انکار کر دیا تھا۔ پھر برطانوی اور امریکی حکومتوں نے اسوان بند کی تعمیر کے لئے مالی و فنی امداد کی یکایک تنسیخ کر دی۔ مجبوراً ناصر نے ۲۶ جولائی ۵۶ کو نہر سوئز کو جو برطانوی اور فرانسیسی کمپنی تھی، قومی ملکیت بنانے کا اعلان کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ نہر مصر کی ملکیت ہے۔ اور اس کی آمدنی سے حکومت اسوان بند تعمیر کرے گی۔ ناصر نے کمپنی کے غیر ملکی مالکان کو معقول معاوضہ پیش کیا۔ لیکن انگریز اور فرانسیسی سرمایہ دار مطمئن نہ ہوئے اور انہوں نے اپنی اپنی حکومتوں پر دباؤ ڈالا کہ وہ اسرائیل کی حمایت میں مصر پر حملہ کرکے ناصر حکومت کا تختہ اُلٹ دے تاکہ وہ اپنی کھوئی ہوئی اجارہ داری بحال کرلیں چنانچہ ۲۹ اکتوبر کو پہلے اسرائیل اور بعد میں برطانوی و فرانسیسی حکومتوں نے بغیر اعلانِ جنگ کئے مصر پر حملہ کر دیا جو رُوس اور سوشلسٹ ملکوں کی پُرزور مخالفت کے باعث ناکام ہوگیا۔ اس طرح صیہونیت اور شہنشاہیت کے عزائم خاک میں مِل گئے۔ اس تجربہ سے مصر کے حکمرانوں نے یہ سبق سیکھا کہ مغربی سرمایہ وطن کی آزادی کی راہ میں حائل ہے۔ نیز ملکی سرمایہ داران کے حلیف نہیں کہ اب ناصر کے سامنے سوائے سوشلزم کے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ چنانچہ ناصر نے پہلی بار ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو قاہرہ یونیورسٹی میں کوآپریٹو کانفرنس کے موقعہ پر واضح لفظوں میں اعلان کیا کہ ہمیں سوشلسٹ، جمہوری، اور اجتماعی سوسائٹی بنانی چاہیئے تاکہ ملک معاشی طور پر آزاد ہوسکے۔

نہر سویز کی جنگ کے بعد سوشلسٹ نظام کیلئے راہ ہموار ہوگئی جنوری ۱۹۵۷ء میں ایسے قانون کا اجراء ہوا جس کی وجہ سے تمام انشورنس کمپنیاں اور غیر ملکی بنک مثلاً بارکلے اور فرانسیسی بنک مصری بنکوں کے ہاتھ فروخت کردیئے گئے اس طرح بیشتر بیرونی سرمایہ مصری حکومت کی تحویل میں لے لیا گیا جس کے انتظام کے لئے حکومت نے ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان متعدد ادارے قائم کئے یا ان کی توسیع کی مثلاً اقتصادی ترقیاتی ادارہ، بنک مصر ادارہ جہازرانی، النصر، سوئز اسٹاک وغیرہ ۱۹۵۸ء میں صنعتی ترقی کے پنج سالہ منصوبے کا نفاذ ہوا جو ۱۹۶۰ء تک پنج سالہ پلان میں ضم کردیا گیا۔ اس پلان میں تقریباً ۷۵ فیصدی سرمایہ صنعت اور پچیس فیصدی زراعت پر لگایا گیا۔

۱۹۶۱ء تک کثیر ملکی سرمایہ قومی تحویل میں لیا جا رہا تھا لیکن اس کے بعد حکومت نے اندرون ملک، اجارہ داری اور سرمایہ داری پر ضرب کاری لگائی تاکہ مختلف طبقوں کے درمیان ناروا امتیازات کو ختم کردیا جائے۔ سو فدان زمین پر حد مقرر کردی گئی۔ تمام نجی بنک اور انشورنس کمپنیاں حکومت کی تحویل میں لے لی گئیں۔ ایک فرد کی زیادہ سے زیادہ آمدنی پانچ ہزار مصری پونڈ سالانہ مقرر کی گئی اور کمپنیوں میں کوئی دس ہزار مصری پونڈ کے حصص سے زیادہ کا مالک نہیں بن سکتا تمام درآمدی اور بیشتر برآمدی تجارت حکومت نے براہ راست اپنے ذمے لے لی لیکن ناصر نے اعلان کیا کہ نیشنل چارٹر کی رو سے اندرون ملک کی ۷۵ فیصدی تجارت نجی ہاتھوں میں ہوگی اور صرف ۲۵ فیصد حکومت کی نگرانی میں رہے گی۔ کارخانوں میں مزدوروں کو ۷ گھنٹہ یومیہ سے زیادہ کام نہیں کرنا ہوگا اور ان کے نفع کی ایک چوتھائی رقم مزدوروں میں تقسیم کردی جائے گی۔ ان اقدامات کو عوام نے سراہا کیونکہ ان کے نفاذ سے معاشرے کی ناہمواری میں بہت حد تک کمی واقع ہوئی اور خصوصاً اجارہ داری کا تو خاتمہ ہی ہوگیا۔

مصر کا نیشنل چارٹر

۲۱ مئی ۱۹۶۲ء کو ناصر نے نیشنل کانگرس آف پاپولر فورسز کے سامنے تیس ہزار الفاظ پر مشتمل ایک مکمل سیاسی اور سماجی پروگرام پیش کیا جس کا مقصد ملک میں نئے نظام کا قیام تھا۔ اس پروگرام کو نیشنل چارٹر کے نام سے موسوم کیا گیا اور اس نے مصر کی واحد سیاسی جماعت عرب سوشلسٹ یونین کی داغ بیل ڈالی۔ اس جماعت کا نصب العین اس پروگرام کی تکمیل تھی اور اس نے نیشنل یونین کی جگہ لے لی۔ اس پارٹی کا بنیادی یونٹ گاؤں، فیکٹری یا کمپنی ہے جس کا اجلاس سال میں دو مرتبہ ہوتا ہے۔ ہر کمیٹی بالائی سطح کے لئے دو ممبروں کو منتخب کرتی ہے۔ پھر یہ دونوں کمیٹیاں مل کر ضلعی کونسل کو منتخب کرتی ہیں۔ جو ہر ماہ دو بار اجلاس کرتی ہے۔ ہر ضلعی کونسل صوبائی کونسل کے لئے دو ممبروں کو چنتی ہے۔ اس کے اوپر عرب سوشلسٹ یونین کی جنرل کانفرنس ہوتی ہے جو صوبائی کونسلوں کے ممبروں، افواج، پولیس، خواتین اور آبادی کے دوسرے عناصر کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جس کا سال میں دو بار اجلاس ہوتا ہے۔ اس کے بعد کانفرنس جنرل کونسل کا انتخاب کرتی ہے جو ہر چھ ماہ پر اجلاس منعقد کرتی ہے اور پھر یہ کونسل بالائی ایگزیکٹیو کمیٹی کا انتخاب کرتی ہے۔ عرب سوشلسٹ یونین میں ہر سطح پر نمائندوں کی نصف تعداد مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ کسانوں کی نمائندگی پہلے پانچ فدان زمین سے کم مالکوں کے لئے مخصوص تھی لیکن بعد میں اس کی حد ۲۵ فدان کردی گئی۔ نئے قانون کے مطابق نیشنل اسمبلی کا انتخاب ہوا جس کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس کے ممبروں کی نصف تعداد مزدوروں، کسانوں پر مشتمل ہو۔ غیر سرکاری ممبروں کے لئے ۷۵ مصری پونڈ ماہانہ تنخواہ مقرر کی گئی۔

ایک نئے اقتصادی نظام کی تعمیر

۲۳ مارچ ۱۹۶۴ء میں مصر کا عارضی آئین بنا جس کی رو سے صدر کا انتخاب پہلے اسمبلی کرتی ہے اور بعد میں استصواب رائے عامہ سے اس کی توثیق کی جاتی ہے۔ صدر کو ایک یا زائد نائب صدر کے تقرر کا اختیار ہے۔ صدر کو جملہ سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی پالیسی کی تشکیل، نیز ان کے نفاذ کا کلی اختیار ہے وہ اسمبلی کو برخواست بھی کرسکتا ہے بشرطیکہ ۶۰ دن کے اندر اندر دوبارہ انتخابات کرائے جائیں۔ ممبروں کو تقریر و تحریر کی مکمل آزادی ہے۔ اس آئین کی رو سے متحدہ عرب جمہوریہ ایک سوشلسٹ اور جمہوری ریاست قرار پائی جو عوامی قوتوں کے اتحاد پر قائم ہے۔ بعض مغرضین کا کہنا ہے کہ مصر میں ایک واحد پارٹی کی آمریت قائم ہے۔ لیکن وہ یہ حقیقت نظر انداز کردیتے ہیں کہ کسی بھی سرمایہ دار ملک کی پارلیمنٹ اس حد تک عوام کی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ دیکھا گیا ہے کہ انگلستان اور امریکہ کی (جو جمہوریت کا گہوارہ کہلاتے ہیں) پارلیمنٹ اور کانگریس میں سرمایہ دار عناصر یا ان کے پٹھو ہمیشہ اکثریت میں ہوتے ہیں۔

عرب سوشلسٹ یونین کی قیادت میں مصر میں نئے اقتصادی نظام کی تشکیل ہو رہی ہے۔ اب ساری بڑی صنعتیں سرمایہ داروں کی بجائے حکومت قائم کررہی ہے۔ باقی ماندہ صنعتیں یا تو قومیائی جا رہی ہیں یا ان کو بہتر انتظام کی خاطر بڑے گروپ میں ضم کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اگست ۶۳ء میں لیور برادرز (LEVER BROS) ۱۴ جہازرانی کی کمپنیاں اور ۲۹ ٹرانسپورٹ کمپنیاں جو جزوی طور پر قومیائی جاچکی تھیں کلی طور پر قومی تحویل میں لے لی گئیں۔ اس کے علاوہ ساری کانیں اور معدنیات کے ٹھیکے منسوخ کرکے انہیں حکومت کی تحویل میں لے لیا گیا۔ مارچ ۱۹۶۴ء میں ٹھیکے کی کمپنیوں کو قومی ملکیت بنا کر انہیں ۳۵ کمپنیوں میں ضم کردیا گیا۔ اور اپریل میں شیل آئل کمپنی کو بھی نیشنلائز کردیا گیا۔

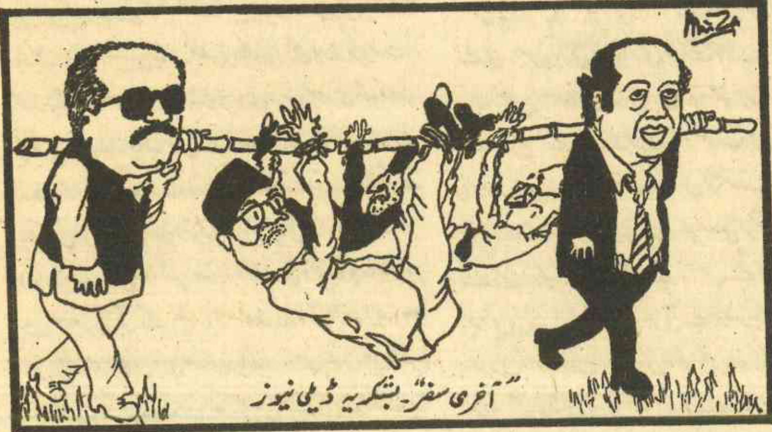
انقلاب کی تجربہ گاہ

ان بنیادی تبدیلیوں سے مصر کی معیشت اب مغربی سرمایہ دار ملکوں کی محتاج نہیں رہی اور نہ ہی اس کا انحصار خام پیداوار کی برآمد پر ہے۔ اس مختصر سی مدت میں تمام مشکلات کے باوجود مصر نے حیرت انگیز صنعتی ترقی کرلی ہے اور اب ملک بہت حد تک خود کفیل ہوتا جا رہا ہے۔ اب مصر، ربر، ٹائر، سیمنٹ، ٹیلیویژن، موٹر، انجن، ریفریجریٹر، ٹیلیفون کیبل، ٹریکٹر اور دیگر اشیاء خود بنانے لگا ہے جن میں سے کچھ تو باہر کے ملکوں میں برآمد بھی کرتا ہے۔ اگر مصر کی ترقی کی یہی رفتار رہی تو وہ دن دور نہیں کہ اس کا مال عرب اور افرو ایشیائی ملک کے بازاروں میں کثرت سے فروخت ہونے لگے گا۔

مصر کی ترقی دیکھ کر مغربی استعمار اور ان کے حلیف شاہ پرست اور اسرائیل نے سازش کرکے مصر پر کبھی تو اسرائیل سے حملے کرائے اور کبھی یمن کی خانہ جنگی میں الجھایا تو کبھی خلیج میں اور اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی تو آئے دن عالمی بنک کا قرض اور دیگر مالی امداد بند کرنے کی دھمکی دیتے رہتے ہیں۔ لیکن مصر سوشلزم کی راہ پر تیزی سے گامزن ہے۔ سچ پوچھئے تو عرب دنیا میں مصر انقلاب اور سوشلزم کی تجربہ گاہ ہے۔ مصر کو دیکھ کر دیگر عرب ممالک میں بھی انقلابات آئے چنانچہ عراق، شام، سوڈان، الجزائر، جنوبی یمن اور لیبیا نے بھی جاگیرداری اور سرمایہ داری کو توڑ کر عوامی اور سوشلسٹ نظام قائم کئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جلد ہی باقی ماندہ عرب ممالک بھی ترقی پسند عرب ملکوں کی صف میں آکھڑے ہوں گے۔ اور اس طرح عرب اتحاد کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکے گا۔

عرب سوشلسٹ یونین میں مزدوروں اور کسانوں کی تعداد ۵۰ فی صد مقرر ہے

"صالحین" کا گروہ شدید داخلی بحران کا شکار ہو چکا ہے


"آخری سفر" - بشکریہ ڈیلی نیوز

مودودی صاحب نے عوام کی طاقت کا غلط اندازہ کیا

قومی اور صوبائی انتخابات میں جماعت اسلامی کی رسوا کن شکست کے بعد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے رفقاء کے لئے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ جماعت کے کارکنوں اور ہمدردوں کو شدید احساسِ شکست، ناامیدی، مایوسی اور اضمحلال سے کس طرح بچایا جائے اور ان میں "بزرگ و برتر صالحین" کے لئے اعتماد کس طرح پیدا کیا جائے۔ مولانا مودودی نے اس سوال کا جواب ایک بار پھر اپنے مخصوص "فلسفیانہ استدلال" اور "عیارانہ منطقیت" میں تلاش کر لیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"دعوتِ حق اور اس کے لئے کام کرنے والے، اگر اپنی حد تک صحیح طریقے سے اصلاح کی کوشش کرتے رہیں اور نظامِ حق قائم نہ ہو سکے تو یہ نظامِ حق اور اس کے لئے کام کرنے والوں کی ناکامی نہیں، بلکہ ان انسانوں کی ناکامی ہے، جن کے معاشرے میں صداقت پروان نہ چڑھ سکی اور بدی ہی پھیلتی پھولتی رہی۔"

اس استدلال کا صریح مفہوم یہ ہے کہ عوام نے اگر انتخابات میں مولانا مودودی کے حسبِ ارشاد، جماعت اسلامی کے امیدواروں کو ووٹ نہیں دیا اور بیچاری جماعت "کفر و اسلام" کے اس معرکے میں مات کھا گئی تو یہ ناکامی "نظامِ حق اور اس کے لئے کام کرنیوالوں (یعنی جماعت اسلامی کے کارکنوں) کی ناکامی نہیں" بلکہ ان انسانوں ہی کی ناکامی ہے۔ جن کے معاشرے میں صداقت پروان نہ چڑھ سکی" یعنی جن لوگوں نے اپنی بدنصیبی کے باعث جماعت کو ووٹ نہیں دیا اور یوں بدی کو پھلنے پھولنے کا موقع مہیا کیا۔
(بحوالہ ہفت روزہ "ایشیا"، ۲۷ دسمبر)

دونوں عوام سے برگشتہ ہیں

معلوم نہیں یہ دلیل جماعت کے صوبائی امیروں، مجالسِ شوریٰ کے ممبروں اور عام کارکنوں کو کس حد تک متاثر کرے گی۔ لیکن جماعت کے اندر امیرِ جماعت اور ان کے رفقائے خاص کے خلاف بغاوت کی جو لہر اٹھی ہے، وہ شاید اتنی آسانی سے فرد نہ ہو سکے اور امیرِ جماعت جو لفظی بازی گری کے کرشمے دکھا کر اپنے متاثرین کو جل دیتے آئے ہیں، اس بار شاید اپنی منطق کے جال سے باہر نکل نہ سکیں۔

مولانا مودودی کا استدلال وہی ہے، جو اس سے پہلے واضح تر الفاظ میں نواب زادہ نصر اللہ خاں کا تھا، انہوں نے دو ٹوک کہہ دیا کہ عوام کا فیصلہ غلط ہے۔ لیکن مولانا، ایک عالم اور انشا پرداز ہیں، وہ بات کہنے کا ڈھب نصر اللہ خاں سے بہتر جانتے ہیں۔ تاہم جماعت کے اندر مختلف کارکن برملا یہ سوال کر رہے ہیں کہ مولانا مودودی نے ایک عوامی جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے عام لوگوں کے سیاسی شعور کی سطح کو سمجھنے میں اتنی سنگین غلطی کیوں کی۔

عوام دشمنی کامیاب نہیں ہو سکتی

مولانا مودودی کے علاوہ نائب امیر مولانا طفیل محمد اور قیم جماعت اسلامی چودھری رحمت الٰہی کے علاوہ تیسرے چوتھے درجے کے تمام جماعتی لیڈر کئی سال سے بیک زبان للکار رہے تھے کہ ہم پاکستان کو سوشلزم کا قبرستان بنا دیں گے۔ انتخابات میں سوشلزم کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیں گے۔ ہمیں اپنے عوام کی قوتِ فیصلہ پر پورا اعتماد ہے "اسلام اور سوشلزم" کی جنگ میں بالآخر "اسلام" کی فتح ہو گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ موجودہ نتائج کی روشنی میں یہ بات واضح ہو گی کہ امیرِ جماعت اور ان کے رفقاء کے تمام اعلانات اور بیانات ان کی صریح کم فہمی پر مبنی تھے۔ ان لوگوں نے احمقوں کی ایک جنت آباد کر لی تھی۔ اس "جنت" کے فرشتے اسلام پسند اخبارات کے مدیر الطاف قریشی، الضیم صدیقی اور اسی سطح کے دوسرے اخبار نویس تھے، جو دل خوش کن جائزے مرتب کر کے مولانا کی خدمت میں پیش کرتے رہتے تھے۔

۷۔ دسمبر کے انتخابات میں جماعت کے غبارے کی ہوا نکل گئی۔ نتائج سے ثابت ہوا کہ جماعتی صحافیوں اور "دانش وروں" کے اندازوں میں اگر کوئی صداقت تھی تو وہ ایک فی صد سے زیادہ نہ تھی۔ چنانچہ عام کارکن جہاں مولانا مودودی اور ان کے حواریوں پر عوامی نفسیات اور مسائل سے لاعلمی کا الزام عائد کرتے ہیں۔ وہیں یہ بھی کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے دانستہ غلط فہمی پیدا کر کے عام لوگوں کو بیوقوف بنائے رکھا اور ناواجب توقعات پیدا کر کے شدید مایوسیوں کو جنم دیا۔

عام کارکن یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہیں کہ جماعت اسلامی جو ۹ سال تک اس علاقے میں جواب پاکستان کا حصہ ہے کام کرتی رہی ہے آخر اب تک لاتعداد وسائل چندے کی کثیر رقم اور اربابِ ثروت کی بے پایاں امداد کے باوصف کیا کر سکی ہے؟۔ اس کا سارا پروپیگنڈہ، شوکت اسلام کی ہنیج سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اس نے عوام میں مرعوب کن پروپیگنڈے کے سوا کچھ اور نہیں کیا، سب سے بڑھ کر ان کے مسائل سے شدید لاتعلقی برتی اور یہی بات اس کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب بن گئی۔ مسائل سے شدید لاتعلقی برتی اور یہی بات اس کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب بن گئی۔

جاگیرداروں کے بہیمانہ استحصال کے جواب میں جماعت اسلامی نے ایک حرف تو یہ کام کیا کہ جاگیرداروں کی سرپرستی اور مالی اعانت پر تکیہ کر کے بیٹھ گئی، اور دوسری طرف جاگیرداروں کی پاسداری اور محافظت کے لئے فتوے لیکر دوڑی کہ "نجی ملکیت" پر دست درازی خلافِ اسلام ہے اور نجی ملکیت کا احترام نعوذ باللہ نصف قرآن ہے رہی سہی کسر نواب مشتاق احمد گورمانی جیسے جاگیرداروں کے جماعت میں شامل ہونے سے پوری ہو گئی۔

سرمایہ داری کو اس نے یہ کہہ کر سہارا دیا کہ اس کے مخالفت سوشلسٹ ہیں، لہٰذا "اسلام دشمن" ہیں، بظاہر اس نے یہ دعویٰ کیا کہ اسلام میں سرمایہ داری سے نجات کا حل بھی موجود ہے، لیکن عملاً یہ حل اس طرح پیش کیا کہ کارخانہ داروں میں اور دفاتر میں اسلام پسند انجمنیں بنائیں جن کا تمام تر مقصد دوسری مزدور تنظیموں کی جدوجہد کو تسبلو تاخ کرنا تھا۔ رفتہ رفتہ "اسلام پسند" تنظیمیں آجروں کی آلہ کار بن گئیں۔ اور عام شہریوں میں جماعت اسلامی کے "پرشکوہ پروپیگنڈے" سے خوف و ہراس کے علاوہ ان کے "مزدور دشمن" رویہ کی بنا پر نفرت اور غصے کے جذبات بھی پیدا ہوتے۔

مسلمانوں میں تفرقہ اندازی

عام جماعتی کارکنوں کے خیال میں "اسلام پسندوں" کے اتحاد میں رخنہ اندازی بھی جماعت کے رویہ سے ہی پیدا ہوئی۔ جماعت اسلامی کے "صالحین" خود کو تمام مسلمانوں کا زعم خود سرپرست اور ان کی جماعتوں پر اپنے آپ کو بالادست سمجھتے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ سب انہی کی رہنمائی میں چلیں۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ جبر اور خود پسندی پر مبنی ہے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ سبھی جماعتیں، جماعت اسلامی سے برگشتہ ہو گئیں۔

کیا جماعت اسلامی، اس بحران سے نجات پا سکے گی۔ اس کا امکان موجودہ حالات میں بہت کم دکھائی دیتا ہے۔

ہمیں زندگی چاہیے (۱)

عوامی نمائندو! تم نے ان سے ووٹ لیا ہے

نعیم آروی

تیئیس سال سے بھوک، بیماری، بیروزگاری اور در در کی ٹھوکریں اس کا مقدر بنی رہیں اور عمر گذرنے کے ساتھ ہر سال اس کی شدت میں اضافہ ہوتا رہا۔ سردی کی طویل راتوں میں تیر کی طرح سنسناتی ہوئی برفیلی ہوائیں، اس کے نحیف اور لاغر جسم کی کھردری جلد پھاڑ دیتیں۔ جون اور جولائی کی تپتی ہوئی دوپہر میں سہراب گوٹھ سے نیو چالی تک پہنچنے میں اس کے ننگے پیروں میں چھالے پڑ جاتے۔ اور سوکھی زبان تالو سے چپک جاتی، حلق میں کانٹے چبھنے لگتے اور تکلیف کی شدت سے بعض اوقات وہ کراہ کر کسی سائبان یا فٹ پاتھ کے کونے میں پناہ ڈھونڈنے پر مجبور ہو جاتا۔ لمبی لمبی، رنگ برنگ کی گاڑیاں اس کے قریب سے دھول اڑاتی ہوئی گذر جاتیں، بند شیشوں کے عقب میں اسے ہر روز بڑے ہشاش بشاش چہرے نظر آتے، اس کے کھردرے اور غلیظ چہرے سے بالکل مختلف، خوبصورت، مطمئن، اور ہر غم سے بے نیاز، وہ اپنے گرد و غبار میں اٹے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اکثر سوچتا "ایسا کیوں ہے"؟ اللہ تعالیٰ نے سارے انسانوں کو یکساں پیدا کیا ہے، پھر دو انسانوں کے درمیان اتنا بڑا فرق کون پیدا کرتا ہے۔ وہ کون ہے جو ایک آدمی کو اٹھا کر لمبی سی گاڑی میں بٹھا دیتا ہے اور دوسرے کو حقیر جانور کی طرح سڑکوں پر مشقت کا بوجھ اٹھانے کے لئے بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے۔



ایک عمر مصائب میں گذر گئی

سہراب گوٹھ کے مولا بخش نے اجرک سے اپنے گرد آلود چہرے کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ سائیں میں کب پیدا ہوا، اور اس وقت میری عمر کتنی ہے، ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا۔ البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا مزدوری اور محنت میری قسمت رہی، آرام کا ایک دن بھی نہ ملا۔ ایک گوٹھ کی جھگی سے دوسرے گوٹھ کی جھگی میں منتقل ہوتا رہا۔ جب ہاتھ پاؤں میں جان تھی تو اونٹ گاڑی چلایا کرتا تھا، اور اناج کی بوریاں غلے کے گودام میں اتارتا تھا۔ جوان بیٹی کی شادی میں قرض چڑھ گیا جسے اتارنے کے لئے اونٹ گاڑی بیچ دی۔ اونٹ گاڑی ہمارے پورے کنبے کا واحد سہارا تھی۔ جب یہ سہارا ختم ہوا تو پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے ہاتھ پاؤں کی محنت پر بھروسہ کرنا پڑا۔ مگر پورے دن کی محنت مزدوری کے بعد بھی بہت کم پیسے ملتے تھے، بڑی مشکلوں سے گھر کا گذارہ ہوتا تھا، اگر بیمار پڑ جاتا تو دوا دارو الگ رہا گھر میں فاقہ پڑ جاتا۔ مجھ سے بیوی بچوں کی بھوک نہ دیکھی جاتی اور بیماری کے باوجود اناج کی بوریاں ڈھونے کے لئے نیو چالی چلا جاتا تھا۔"

سہراب گوٹھ کے باشندے مولا بخش کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی اللہ بخش بھی تھا۔ دونوں چار میل کی مسافت طے کرنے کے

(باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ فرمائیں)

منع مزارعت کی کل احادیث بہت موثق ہیں

"حضرت معاذ بن جبل اپنی زمین نبی کریم صلعم کے عہد اور آپ کے بعد بھی حضرت ابوبکر و حضرت عمر اور حضرت عثمان کے زمانہ میں تہائی اور چوتھائی پیداوار کی بٹائی پر زراعت کے لئے مہیا کرتے تھے۔" صحیح ابن ماجہ میں طاؤس سے یہ روایت نقل ہوئی ہے۔ اس میں پہلا سہو تو یہ ہوا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل کا عمواس کے طاعون میں انتقال ہوا ہے یہ حضرت عمر کا عہد خلافت ہے۔

اسلامی شریعت میں بٹائی ناجائز ہے (۸)

کیا حضرت معاذ مزارعت پر زمین دیتے تھے؟

جری احمد سید

لیکن اس سے پہلے ان کے پاس کب تک زراعتی زمینیں تھیں جو وہ بٹائی پر دیتے؟ معاذ ابن جبل کو ۹ھ میں یمن کی دینی و دنیوی ولایت تفویض ہوئی۔ اس سے پہلے کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت معاذ بہت مقروض ہوگئے تھے قرضہ جائداد سے کچھ زیادہ ہی ہوگیا تھا۔ قرض خواہوں نے واویلا مچایا اور رسول صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی۔ رسول اللہ صلعم نے کل جائداد قرض خواہوں میں تقسیم کر دی۔ اب حضرت معاذ بالکل مفلس تھے۔

کہا جاتا ہے کہ وہ بہت ہی فیاض تھے انہوں نے یہ سارا قرضہ شاید ملی و دینی ضروریات کے پورا کرنے یا مہاجرین و انصار کے حاجت مندوں کی حاجت روائی کرنے کے لئے قرض لیا تھا۔ اسی لئے شاید رسول اللہ صلعم کو آپ کا اتنا لحاظ تھا کہ آپ نے حضرت معاذ کو یمن کی ولایت سپرد کر دی کہ انکی روزی کا انتظام ہو جائے۔

حضرت معاذ ۱۱ھ میں یمن کی ولایت سے واپس مدینہ تشریف لائے یہ حضرت ابوبکر کی خلافت کا زمانہ ہے آپ نے یمن کا حساب چکایا اور مع اہل و عیال شام چلے گئے وہاں فوجی و دینی خدمات انجام دیتے رہے اور ۱۸ھ میں طاعون عمواس میں محبوب حقیقی سے جا ملے۔ گویا حضرت معاذ بن جبل ۸ یا ۹ھ سے پہلے زمینیں بٹائی پر دیتے تھے۔ نتیجہ یہ نہیں نکلتا کہ حضرت جابر جیسے فقیہ حضرت ابوہریرہ سے مکثر حدیث رافع سے ثقہ صحابی بے سمجھے بوجھے رسول اللہ صلعم سے ایک لایعنی حکم منسوب کر دیتے ہیں۔ اس سے ہمارے اس خیال کی توثیق ہوتی ہے کہ منع کراء الارض کی احادیث ۹ ہجری کے بعد ہی کی ہیں اس سے پہلے کی نہیں۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے عہد میں زمین کو کرایہ پر دینے کے مختلف طریقے تھے (۱) پانی کی نالیوں پر کی پیداوار مالک کی ہوگی اور باقی پیداوار کاشتکار کی ہوگی (۲) ایک حصہ خاص کی پیداوار مالک اور باقی کاشت کار کی (۳) اور یہ طریقہ کہ کل پیداوار کا نصف، تہائی یا چوتھائی مالک کا ہوگا باقی کاشتکار کا۔

تمام دینی و سماجی و اقتصادی احکامات کسی نہ کسی موقع سے نازل ہوئے ہیں لیکن احکامات میں عمومیت ہوتی ہے وہ ایک کھیت ایک خاندان ایک واقعہ پر محدود نہیں ہوتے یہ ثابت ہے کہ کل پیداوار کی بٹائی پر بھی معاملہ ہوتا تھا، پانی کے راستوں کی پیداوار پر بھی اور کسی خاص قطع زمین کی پیداوار پر بھی متواتر احادیث ہم تک پہنچی ہیں کہ بٹائی اور مزروعہ زمین کا کرایہ لینا حضور صلعم نے منع فرمایا ہے تو میری سمجھ سے باہر ہے کہ میں اس کو صرف پانی کی نالیوں پر کی پیداوار سے مخصوص کر دوں یا کسی خاص قطع زمین کی پیداوار سے۔

وہ احادیث جن میں غلہ کی صورت میں کرایہ دینے کا ذکر ہے وہ ہمارے دائرہ بحث سے خارج نہیں ہو جاتی ہیں۔ اگر کسی موقع پر کسی کا کسی سے کوئی جھگڑا ہو گیا تو شاید اس موقع پر بھی رسول اللہ صلعم نے یہ فرمایا ہوگا لیکن اگر رافع فرماتے ہیں کہ میرے کھیت پر سے آپ گزر رہے تھے اور آپ نے پوچھا — وغیرہ (حدیث اوپر گذر چکی ہے) تو کیا پہلا واقع دوسرے واقع کو منسوخ کر دے گا؟ یا دوسری حدیث میں (نعوذ باللہ) غلط بیانی ہوئی ہے۔

احادیث کراء الارض و مزارعت پر صحابہ کا عمل

حضرت رافع بن خدیج حضرت جابر ابن عبداللہ حضرت سعید خدری حضرت ابوہریرہ اور دیگر صحابہ جن سے یہ احادیث ہم تک پہنچی ہیں عام لوگوں میں سے نہیں ہیں۔

حضرت رافع بنو حارثہ کے رئیس ہیں اور مرتے دم تک اپنے گھرانے کے رئیس رہے یہ سوچنا کہ ان کی "قوم" کا عمل ان کے فتوی کے خلاف ہوگا ایک لایعنی خیال ہے۔

حضرت جابر اپنے قبیلہ بنو سلمہ کے سردار تھے اور مرتے دم تک اپنی قوم کے سردار رہے ان کے قبیلہ کا ان کے فتوی سے انحراف کرنے کا امکان نہیں۔

ابو سعید خدری اسی طرح اپنے قبیلہ کے رئیس تھے اور مرتے دم تک رہے۔ ان تینوں بزرگوں نے بڑی عمریں پائیں اور ان کا فیض عرصہ تک جاری رہا ان کا فیض محض اپنے قبیلہ تک محدود نہیں ہو سکتا۔ گویا کہ انصار صحابہ کا عمل ان احادیث پر قریب قریب ثابت ہے۔ یہ کہنا کہ صحابہ کا عمل ان احادیث پر نہیں رہا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

سونے چاندی کی صورت میں کرایہ

معاشیات کی ابجد سے واقف حضرات بھی جانتے ہیں کہ "مال کے بدلے مال" کی معاشیات میں قیمت لگانے میں یہ کہنا کہ "ایک من گیہوں" کرایہ ہے یا "چند ماشہ سونا" یا چند اونٹ یا چند بھیڑ بکریاں سب ایک ہی معنی رکھتی ہیں اگر غلہ کی صورت میں کرایہ ممنوع قرار دیا گیا ہے تو ہر وہ چیز جس کی قیمت ہو سکتی ہے اور جو بدلے میں دی جا سکتی ہے اس میں شمار ہوگی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ غلہ کی صورت میں کرایہ ممنوع ہو جائے اور سونے کی صورت میں جائز ہے۔ یہ صرف حیلہ شرعی ہوگا اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی تعمیل نہ ہوگی۔ کرایہ زمین ہر شکل میں، ہر حالت میں ممنوع ہوگا وہ نوٹوں کی صورت میں ہو، سونے کی صورت میں، یا اونٹ بکری، گیہوں یا دالوں کی صورت میں۔

خلاصہ کلام

ہم نے قریب قریب ان تمام احادیث کا استقصاء کر لیا ہے جن کا تعلق مزارعت سے ہے۔ یہ بڑی جسارت ہوگی کہ ہم کسی صحابی کے متعلق خصوصاً جبکہ وہ مکثرین حدیث میں سے ہو یا اپنے وقت کا فقیہہ بھی ہو یہ کہیں کہ وہ آدھی پردھی حدیث سن بھاگتے اور اس کی تبلیغ کرنے لگے۔ نہیں۔ منع مزارعت کی کل احادیث بہت موثق احادیث ہیں باقی احادیث جو انکے خلاف معلوم ہوتی ہیں انکو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہم اپنے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ کل احادیث اس زمانے کے اقوال و احکام رسول ہیں جب ربوا کی حرمت کی آیت نازل ہوئی تھیں اور یہ زمانہ ۹ اور ۱۰ ہجری سے آگے نہیں جاتا۔ باقی احادیث اور تعامل صحابہ مہاجرین و انصار اس سے پہلے کے زمانہ پر دلالت کرتے ہیں۔

جہاں تک انصار و مہاجرین کے معاملہ کا تعلق ہے جو مواخاۃ کے بعد عمل میں آیا وہ کسی طرح بھی زمیندار کاشتکار والی مزارعت کا معاملہ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح یہود خیبر کے ساتھ معاملہ دو قوموں کے درمیان معاملہ تھا جن میں ایک فاتح اور دوسری مفتوح تھی۔ اور جو محاصل اسے حاصل ہوئے تھے وہ از قسم خراج تھے یہ معاملہ بھی کسی طرح مزارعت کا معاملہ نہیں تھا۔

آخر میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ احادیث منع مزارعت ہمارے لئے قطعی کا درجہ رکھتی ہیں اور ان پر عمل کرنا ہم پر فرض ہے۔

(مکمل)

اثاثوں کی قیمت کے اعتبار سے حبیب خاندان سب سے زیادہ دولت مند ہے

۱۹۴۱ء میں حبیب بنک مشترک سرمایے سے قائم کیا گیا۔ ۱۹۴۲ء میں حبیب انشورنس کا قیام عمل میں آیا۔ چار سال بعد ۱۹۴۶ء میں حیدری کنسٹرکشن قائم ہوئی۔ ۱۹۵۴ء میں حبیب خاندان کی ان تینوں کمپنیوں کا مجموعی اداشدہ سرمایہ دو کروڑ روپے تھا، جو بعد میں ۴۰۰ فیصد اضافے کے ساتھ ۱۰ کروڑ ہو گیا

حبیب خاندان کی جو کمپنیاں کراچی اسٹاک ایکسچینج میں درج ہیں، اداشدہ سرمایہ کے لحاظ سے اُس کا شمار، پاکستان کے ۲۲ بڑے سرمایہ دار خاندانوں میں چوتھے نمبر پر ہوتا ہے۔ اگر ان کے اثاثوں کی قیمت کو معیار بنایا جائے تو یہ خاندان ۲۲ خاندانوں میں نمبر اوّل ہے۔ آدم جی، داؤد اور سہگل کا نمبر بھی اُن کے بعد آتا ہے۔

تقسیم سے پہلے یہ خاندان بمبئی میں سونے کا کاروبار کرتا تھا۔ اپنا بینک قائم کرنے کے بعد کچھ عرصے تک وہ سونے کا کاروبار کرتے رہے۔ حبیب بینک کے قیام کے بعد ہندوستانی مسلمان جن کی دلی خواہش تھی کہ مسلمانوں کا بھی ایک تجارتی بینک ہو، از خود اس بینک میں اپنا روپیہ جمع کرنے لگے۔

آزادی کے بعد حبیب خاندان کو ارتکاز سرمایہ کے جو مواقع میسّر آئے اُن میں تارکین وطن کا حبیب بینک میں چھوڑا ہوا وہ سرمایہ بھی شامل تھا جس کا کوئی دعویدار نہ تھا نیز تقسیم کے بعد کپاس جیسے شعبوں میں جو افراتفری پھیلی ہوئی تھی اُس پر قابو پانے کے لئے قرضوں کی سہولتوں میں حکومت کی سرپرستی شامل تھی۔

حبیب خاندان کی پانچ قابلِ ذکر کمپنیاں، حسب ذیل ہیں

(۱) حبیب بینک لمٹیڈ۔

(۲) حبیب انشورنس۔

(۳) حیدری کنسٹرکشن۔

(۴) حبیب شوگر۔

(۵) علی اصغر ٹیکسٹائل ملز۔

حبیب خاندان کی کمپنیوں کے اثاثوں کی قیمت ۱۹۶۲ء میں ایک ارب ۶۰ کروڑ تھی جو ۱۹۶۶ء میں بڑھ کر چار ارب ۷ کروڑ روپئے ہو گئی۔ اس کے برعکس ۱۹۶۶ء میں سہگل خاندان کی کمپنیوں کے اثاثوں کی قیمت ۳ ارب ایک کروڑ روپئے، آدم جی خاندان کی کمپنیوں کے اثاثوں کی قیمت ایک ارب ۶۹ کروڑ روپے اور داؤد خاندان کی کمپنیوں کے اثاثوں کی قیمت ۴۶ کروڑ روپے تھی۔

۱۹۶۹ء میں حبیب خاندان کی کمپنیوں کے اداشدہ سرمائے کی مجموعی رقم دس کروڑ روپے تھی اُس وقت پاکستان کے ۲۲ بڑے خاندانوں میں اُس کا نمبر ۴ تھا۔ ۱۹۶۵ء میں اس خاندان کی کمپنیوں کا اداشدہ سرمایہ کروڑ روپے تھا۔ اس وقت اُس کا نمبر چھٹا تھا۔ پہلے پانچ خاندان سہگل، آدم جی داؤد، کریسنٹس اور ولیکا تھے۔ ۱۹۶۰ء میں حبیب خاندان آدم جی، داؤد اور سہگل خاندانوں کے بعد چوتھے نمبر پر تھا۔ ۱۹۵۵ء میں جب سہگل خاندان نے مشترک سرمائے کے کاروبار کے میدان میں قدم نہیں رکھا تھا، حبیب خاندان، آدم جی داؤد اور ولیکا خاندانوں کے بعد چوتھے نمبر پر تھا۔

۱۹۴۹ء میں تین کمپنیاں

۱۹۴۹ء میں کراچی اسٹاک ایکسچینج میں حبیب خاندان کی حسب ذیل تین کمپنیاں درج تھیں حبیب بینک، حبیب انشورنس اور حیدری کنسٹرکشن۔ یہ تینوں کمپنیاں آزادی سے پہلے مشترک سرمائے سے قائم کی گئی تھیں۔ اِن میں سب سے پہلے ۱۹۴۱ء میں حبیب بینک مشترک سرمائے سے قائم کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں حبیب انشورنس کا قیام عمل میں آیا۔ اُس کے چار سال بعد یعنی ۱۹۴۶ء میں حیدری کنسٹرکشن قائم ہوئی۔ ۱۹۵۴ء میں حبیب خاندان کی ان تینوں کمپنیوں کا مجموعی اداشدہ سرمایہ ۲ کروڑ روپے تھا۔ حبیب خاندان کی تمام کمپنیوں کا سرمایہ بڑھ کر دس کروڑ روپے ہو گیا یعنی اس میں چار سو فیصد کا اضافہ ہوا۔

اداشدہ سرمایے میں اضافہ

حبیب خاندان کی کمپنیوں کے اداشدہ سرمائے میں وقتاً فوقتاً جو اضافہ ہوا ہے وہ درجِ ذیل اعداد و شمار سے واضح ہے۔

سال	حبیب خاندان کا اداشدہ سرمایہ (کروڑوں میں)
۱۹۵۵	۲٫۱۰
۱۹۶۰	۳٫۶
۱۹۶۵	۷٫۲
۱۹۶۹	۱۰٫۲

حبیب خاندان کی کمپنیوں کے اداشدہ سرمائے میں سب سے زیادہ تیز رفتار اضافہ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۵ء کے دوران میں ہوا جب انہیں حبیب بینک کے لئے مزید سرمایہ جاری کرنے کی اجازت ملی اور حبیب شوگر ملز قائم کر کے صنعتی میدان میں داخل ہوئے۔ ۱۹۶۸ء میں علی اصغر ٹیکسٹائل ملز کے قیام کے ذریعہ اس نے صنعتی شعبہ میں مزید پاؤں پھیلائے۔

۱۹۵۴ء سے حبیب خاندان کی مختلف کمپنیوں کے اداشدہ سرمائے میں فرداً فرداً جو اضافہ ہوا وہ حسب ذیل اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے

ایک ارب ۶۰ کروڑ

کا سرمایہ

چار سال میں

چار ارب سے

بڑھ گیا

حبیب خاندان کا ادا شدہ سرمایہ

سال	حبیب بینک	حبیب انشورنس	حیدری کنسٹرکشن	حبیب شوگر	علی اصغر ٹیکسٹائل	کل میزان
۱۹۵۴ء	۱ کروڑ ۵۰ لاکھ	۵۰ لاکھ	۱۰ لاکھ	———	———	۲ کروڑ ۱۰ لاکھ
۱۹۵۵ء	۱ کروڑ ۵۰ لاکھ	۵۰ لاکھ	۱۰ لاکھ	———	———	۲ کروڑ ۱۰ لاکھ
۱۹۵۶ء	۱ کروڑ ۵۰ لاکھ	۵۰ لاکھ	۱۰ لاکھ	———	———	۲ کروڑ ۱۰ لاکھ
۱۹۵۷ء	۱ کروڑ ۵۰ لاکھ	۵۰ لاکھ	۱۰ لاکھ	———	———	۲ کروڑ ۱۰ لاکھ
۱۹۵۸ء	۲ کروڑ	۵۰ لاکھ	۱۰ لاکھ	———	———	۲ کروڑ ۶۰ لاکھ
۱۹۵۹ء	۲ کروڑ	۵۰ لاکھ	۱۰ لاکھ	———	———	۲ کروڑ ۶۰ لاکھ
۱۹۶۰ء	۳ کروڑ	۵۰ لاکھ	۱۰ لاکھ	———	———	۳ کروڑ ۶۰ لاکھ
۱۹۶۱ء	۳ کروڑ	۵۰ لاکھ	۱۰ لاکھ	———	———	۳ کروڑ ۶۰ لاکھ
۱۹۶۲ء	۳ کروڑ	۵۰ لاکھ	۱۰ لاکھ	———	———	۵ کروڑ ۱۰ لاکھ
۱۹۶۳ء	۳ کروڑ	۵۰ لاکھ	۱۰ لاکھ	½۱ کروڑ	———	۵ کروڑ ۱۰ لاکھ
۱۹۶۴ء	½۳ کروڑ	۵۰ لاکھ	۱۰ لاکھ	½۱ کروڑ	———	۵ کروڑ ۶۰ لاکھ
۱۹۶۵ء	۵ کروڑ	۵۰ لاکھ	۱۰ لاکھ	۱ کروڑ ۶۰ لاکھ	———	۷ کروڑ ۲۰ لاکھ
۱۹۶۶ء	۶ کروڑ	۵۰ لاکھ	۱۰ لاکھ	۱ کروڑ ۶۰ لاکھ	———	۷ کروڑ ۷۵ لاکھ
۱۹۶۷ء	۶ کروڑ	۵۰ لاکھ	۱۰ لاکھ	۱ کروڑ ۶۵ لاکھ	———	۸ کروڑ ۳۵ لاکھ
۱۹۶۸ء	۶ کروڑ	۵۰ لاکھ	۱۰ لاکھ	۱ کروڑ ۷۵ لاکھ	۸۵ لاکھ	۹ کروڑ ۲۰ لاکھ
۱۹۶۹ء	۷ کروڑ	۵۰ لاکھ	۱۰ لاکھ	۱ کروڑ ۷۵ لاکھ	۸۵ لاکھ	۱۰ کروڑ ۲۰ لاکھ

آیئے اب حبیب خاندان کی کمپنیوں کا فرداً فرداً جائزہ لیں۔

حبیب بینک ۱۹۴۱ء میں بمبئی میں قائم ہوا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں اس کی صرف دو شاخیں تھیں۔ ۱۹۴۷ء میں جس سال برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی، اس کی شاخوں کی تعداد ۲۱ تھی۔ ۱۹۶۶ء میں اس کی شاخوں کی تعداد ۵۰۲ تک پہنچ گئی جن میں بمبئی (ہندوستان) اور کوالالمپور (ملائشیا) کی غیر ملکی شاخیں بھی شامل تھیں۔ البتہ ان میں حبیب بینک اوورسیز لمیٹڈ کی عدن، بیروت، برمنگھم، بریڈ فورڈ، کولمبو، لندن، مانچسٹر، ممباسا، پورٹ لوئیس اور شارجہ کی غیر ملکی شاخیں شامل نہیں تھیں۔ حبیب بینک میں توسیع کا سلسلہ جاری ہے۔ ۱۹۶۶ء میں حبیب بینک میں ۲ ارب ۶۱ کروڑ روپے جمع تھے۔ جبکہ اسی سال نیشنل بینک پاکستان میں ۱۲ ارب ۷ کروڑ روپے، یونائیٹڈ بینک میں ۳۰ کروڑ روپے جمع تھے۔

بنک اور انشورنس کمپنی

حبیب انشورنس کمپنی لمیٹڈ ۱۹۴۲ء میں بمبئی (ہندوستان) میں مشترک سرمائے سے قائم کی گئی۔ لیکن اس کا رجسٹرڈ دفتر تقسیم سے بہت پہلے کراچی منتقل کر دیا گیا۔ حبیب انشورنس ہندوستان کے مسلمانوں کے بیمہ کا کاروبار حاصل کرنے کی غرض سے قائم کی گئی تھی۔ حبیب انشورنس ترقی کر کے پاکستان کی دوسری سب سے بڑی انشورنس کمپنی بن چکی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں اس کے پاس زندگی کے بیمہ کی ۴۶ ہزار پالیسیاں تھیں جبکہ پاکستان کی سب سے بڑی انشورنس کمپنی۔ ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی کے پاس ایک لاکھ ۲۱ ہزار زندگی کے بیمہ کی پالیسیاں تھیں۔ یہ کمپنی کسی بڑے تجارتی خاندان سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ بیمہ سے تعلق رکھنے والے افراد کے زیرِ اہتمام ہے۔ جہاں تک بیمہ شدہ رقم کا تعلق ہے۔ اس کی حیثیت موخرالذکر سے بھی بہتر ہے۔ کیونکہ حبیب انشورنس کے پاس بیمہ شدہ پالیسیوں کی مجموعی رقم ۸۰۴ کروڑ ہے جبکہ ایسٹرن فیڈرل کے پاس بیمہ شدہ پالیسیوں کی مجموعی رقم ۹۷ کروڑ ہے۔

بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کا سرمایہ بالعموم تعمیرات اور ایسی عمارات پر لگایا جاتا ہے جن سے کرائے کی صورت میں آمدنی ہوتی ہے۔ لہٰذا حبیب خاندان نے اپنے کاروباری سرگرمیوں کے آغاز ہی سے حیدری کنسٹرکشن کمپنی قائم کی تھی۔ یہ کمپنی نئے جو تعمیراتی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ بعض بڑے بڑے کنٹریکٹ حاصل کیے۔ لہٰذا اب وقت آگیا ہے۔ کہ نجی بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کے ذریعہ قرضے کے ارتکاز کو اس طرح اعتدال کی حد پر رکھا جا سکتا ہے کہ سرمایہ کی تشکیل کے اداروں کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی ان رقم کو جو سرمایہ کاری میں لگاتے ہیں، ان کا زیادہ سے زیادہ حصہ متوسط طبقہ اور محنت کش طبقہ کے لئے مکانات کی تعمیر پر صرف کریں۔

بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لئے جانے کے خدشے نے حبیب خاندان کو صنعتی میدان میں اترنے پر مجبور کیا۔ لہٰذا حبیب شوگر ملز لمیٹڈ کو ۱۹۶۲ء میں رجسٹرڈ کیا گیا۔ جس کا اصل مقصد شکر سازی شکر اور اس کی متعلقہ اور ذیلی پیداوار کا کاروبار کرنا تھا۔ ۱۵۰۰ ٹن گنا روزانہ پیلنے کی گنجائش کی فیکٹری لگائی گئی۔ فروری ۱۹۶۴ء کے پہلے ہفتہ میں آزمائشی طور پر شکر سازی اور گنا پیلنے کا کام شروع کیا۔

اس فیکٹری نے ۱۹۶۴ء میں ۴۵۴،۳۵۰۸۵ من شکر ۱۹۶۵ء میں ۹۷۷،۸۲،۲ من شکر اور ۱۹۶۶ء میں ۵۴،۸۴۷،۵۷ من شکر تیار کی۔ فیکٹری نے گڑ کھنڈساری وغیرہ کو بھی پروسس کیا تاکہ اس سے شکر بنائی جائے۔ کمپنی نے ۱۹۶۶ء میں ڈسٹیلری پلانٹ کی تنصیب کی۔ اور اسے آزمائشی طور پر چلایا گیا۔ حبیب شوگر ملز لمیٹڈ نے بینک سے دو غیر ملکی قرضے حاصل کئے۔ ان میں سے ایک قرضہ ۲۰۰،۸۶،۲ فرانسیسی فرانک کا تھا۔ دونوں قرضے ضمانت، ادائیگی اور سود وغیرہ کی شرائط پر جن کی تفصیلات قرضوں کے معاہدوں میں درج تھیں۔ حاصل کئے گئے۔

کمپنیاں اور ان کے ڈائرکٹر

صنعتی شعبے میں علی اصغر ٹیکسٹائل ملز ابھی تک حبیب خاندان کا آخری صنعتی منصوبہ ہے۔ نووارد علی اصغر ٹیکسٹائل ملز کے علاوہ ۱۹۶۶ء میں حبیب خاندان کی چار درج شدہ کمپنیوں کے مجموعی ۲۷ ڈائرکٹروں میں سے ۱۱ ڈائرکٹر براہ راست حبیب خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

	جیب خاندان کے افراد کے نام	حبیب خاندان کی چار کمپنیوں میں ڈائرکٹرشپ کی تعداد
۱	اسمٰعیل اے حبیب	۳
۲	حمید ڈی حبیب	۲
۳	احمد حبیب	۱
۴	یوسف اے حبیب	۱
۵	حیدر ایم حبیب	۱
۶	رشید ڈی حبیب	۱
۷	سلیمان۔ ایم حبیب	۱
۸	علی اصغر جی حبیب	۱
	میزان کل	۱۱

بقیہ ڈائرکٹروں میں سے خاصی تعداد حبیب گروپ کے ملازموں کی ہے۔ حبیب خاندان میں نمایاں شخصیت رشید ڈی حبیب کی ہے۔ ۱۹۶۶ء میں جن بڑے بڑے کاروباری خاندانوں کے افراد حبیب خاندان کی کمپنیوں میں ڈائرکٹر تھے۔ ان میں دادا آدم جی خاندان کے افراد شامل تھے۔

افسانہ

شاہد رضوی



طوفان کی آخری لاش

یہ جو ایک مردہ جسم کھیت کی مینڈھ پر پڑا ہوا ہے جس کے پیر کھیت کے اندر ہیں اور باقی جسم باہر۔

یہ میں ہوں۔

وہ جو ایک تین سال کے بچے کی پھولی ہوئی لاش نہر کے کنارے پڑی ہے۔

یہ بھی میں ہوں۔

آپ جس طرف بڑھ رہے ہیں، ادھر ایک جوان عورت کی عریاں







لاش جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی آپ نے ضرور دیکھی ہو گی۔

وہ لاش بھی میں ہوں۔

اس سے کہیں آگے آپ نے بچوں بوڑھوں جوانوں کی سینکڑوں لاشیں دیکھی ہوں گی۔ اور میرے گاؤں سے آگے لاکھوں ایسے ہی ٹوٹے جسم جن کا زندگی سے اب کوئی ناطہ نہیں پڑے دیکھیں گے۔

یہ سب بھی میرے ہی جسم ہیں۔

کیونکہ طوفان کا وہ ایک ریلا تھا جس نے لاشوں کی یہ فصل کاٹی ہے۔ اس سے پہلے یہ کام کبھی بیماریاں کرتی تھیں۔ اور کبھی بھوک اور افلاس۔ جن کے طوفان وقفہ وقفہ سے آتے ہی رہتے ہیں۔ اور بھینٹ لے کر ہی ٹلتے ہیں۔ کسی گھر سے ایک اور کسی گھر سے دو۔ لیکن یہ طوفان تو ایسا سناٹا چھوڑ گیا کہ کہیں سے رونے کی آواز بھی نہیں آتی۔

لیکن یہ سب آپ کو بتانے سے کیا حاصل، آپ خود اسی سناٹے کی پکار سن کر آئے ہیں۔ میں تو آپ کو اس طوفان کی کہانی سناؤں جس نے انسان اور متعفن لاش کا فرق اٹھا دیا۔ ایک ریلے میں سارے رشتہ بہا لے گیا۔ یا ان چھوٹے چھوٹے طوفانوں کی کہانی سناؤں جو اس بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھے۔

پہلے آپ بڑے طوفان کی کہانی سنیئے تب ہی ان چھوٹے طوفانوں کی کہانی اپنے آپ سمجھ جائیں گے۔

میں سو رہا تھا۔ کہ لہروں کے شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ بیوی اور پانچ بچوں کو لے کر میں جلدی جلدی چھت پر چڑھ گیا۔ پانی کا ریلا سر سے گزر رہا تھا۔ میری بیوی نے پانچوں بچوں کو سنبھال رکھا تھا اور میں نے کھڑے ہو کر طوفان کا رخ اور پناہ کی جگہ دیکھنے کی کوشش کی۔ ایکا ایکی میری بیوی نے چیخ کر کہا۔

"مجھ سے سب بچے نہیں سنبھلتے۔ کیا کروں"

معلوم نہیں آپ ہوتے تو کیا کہتے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میں نے کیا جواب دیا۔ مگر میرا جواب سن کر چار بچے جو سمجھدار تھے۔ ماں کو لپٹ گئے اور رونے لگے "اماں مجھے نہ چھوڑو"۔ میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں سمندر کی ایک لہر آئی اور میں ڈوبتا چلا گیا۔

سو میں اب ایک لاش ہوں جس کے پیر کھیت کے اندر ہیں اور مینڈھ پر سے ٹکا ہوا سارا جسم کھیت سے باہر پڑا ہوا ہے۔ لیکن میں ایک لاش ہی نہیں ہوں ایک گنہگار بھی ہوں جسے اس طوفان نے اور اس سے پہلے کے طوفانوں نے تخلیق کیا ہے۔

اس ملک پر بائیس سال تک حکمران رہنے والوں کی شرمناک بے حسی کا گنہگار۔ جب کوئی طوفان آتا ہے

خورشید احمد ایم اے

بھولا

(مشرقی پاکستان کا ایک طوفان زدہ جزیرہ)

اس جزیرے میں جہاں موت کی خاموشی ہے
کل یہاں زیست کے پُر کیف مناظر بھی تھے
اپنے پیاروں کی طربناک صدائیں بھی تھیں
اپنے ماں باپ بھی تھے اپنے برادر بھی تھے
اپنے کھلیان بھی تھے اپنے گھروندے بھی تھے
عیش کی شامیں تھیں خوشیوں کے سویرے بھی تھے
آسماں بوس درختوں کی قطاریں بھی تھیں
ان درختوں پہ پرندوں کے بسیرے بھی تھے
ہائے وہ ساحلی گاؤں وہ مچھیروں کے ہجوم
اور وہ سطحِ سمندر پہ سفینوں کا خرام
بادباں اُڑتے ہوئے جیسے ہزاروں پرچم
زندہ جذبوں کے امیں زندہ اُمنگوں کے پیام
اے مرے دوست تو کس کس کا کرے گا ماتم
دلِ برباد میں غم سہنے کی طاقت نہ رہی
جس طرف دیکھئے بے گور و کفن لاشے ہیں
کوئی بھی چیز جزیرے میں سلامت نہ رہی
زندہ لوگوں سے کہو اپنے جگر گوشوں کو
موت کی وادی میں ڈھونڈو گے تو مل جائیں گے



ماہنامہ حروف کراچی

ایڈیٹر و پبلشر :- انور شعور
مقام اشاعت :- کراچی
صفحات :- ۹۶
قیمت :- ایک روپیہ

ماہنامہ "حروف" کا تیسرا شمارہ پیش نظر ہے، جو پچھلے دونوں شماروں سے مندرجات اور لے آؤٹ وغیرہ میں کہیں بہتر ہے۔ اس دور میں جبکہ عام قارئین کا رجحان خالص ادب سے ہٹ کر سنسنی خیز یا صحافیانہ تحریروں کی جانب زیادہ ہوگیا ہے اور ڈائجسٹ قسم کے رسالے زیادہ کامیاب ہو رہے ہیں خالص ادبی قسم کا جریدہ نکالنا بڑے حوصلہ کا کام ہے۔

پرچے کی ترتیب میں بڑا توازن ہے۔ اور مضامین کا انتخاب سلیقے سے کیا گیا ہے۔ اگر اس میں ایک طرف فراق گورکھپوری کی پہلو دار شخصیت پر نقاش کاظمی کا مضمون قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کراتا ہے تو دوسری جانب شاعری کی زبان کے عنوان سے انجم اعظمی کا مقالہ دعوتِ فکر دیتا ہے۔

نظموں میں مجھے احمد ندیم قاسمی کی نظم پیشگوئی بہت پسند آئی قاسمی صاحب کی شاعری کبھی قنوطیت کا شکار نہیں ہوئی۔ رجائیت ان کی شاعری اور زندگی کے نمایاں پہلو ہیں۔ یہ نظم بھی ان کی شاعری اور شخصیت کے اس پہلو کی نمائندہ ہے۔ دوسری نظم جو مجھے زیادہ پسند آئی وہ جواں سال شاعر رضی اختر شوق کی مختصر نظم "شہر" ہے۔

قرۃ العین حیدر کا نام ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ ان کا افسانہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قرۃ العین حیدر کے افسانے "حسب نسب" کا موضوع تو فرسودہ ہے لیکن قرۃ العین حیدر کے قلم نے اُسے تازگی بخش دی ہے۔ افسانہ شروع کرنے کے بعد ختم کرنے کو جی نہیں چاہتا ہے، خاص طور سے "چھمی" بیگم کا کردار افسانہ ختم ہونے کے بعد تک دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔

منظومات کے حصّے کو مزید معیاری بنانے کی گنجائش موجود ہے۔ اس کے علاوہ معیشت، سائنس و نفسیات پر پرمغز مقالے، طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کی وجہ سے، اس شمارے کو بالعموم پسند کیا جائے گا۔

ہاں میرے ملک کے زردار بہت اچھے ہیں؟

(قومی نظموں کا مجموعہ)
از :- ابوالفہیم خورشید خاور امروہوی
صفحات :- ۶۴
قیمت :- ۲ روپے ۵۰ پیسے

خورشید خاور امروہوی کے بارے میں، رئیس امروہوی کا ارشاد ہے کہ "وہ بیانیہ شاعر ہیں۔ ملّت کے درد سے معمور اور صہبائے حقیقت سے مخمور۔ اس مجموعے کی تمام نظمیں، انہی احساسات و جذبات کی ترجمان ہیں، جنہیں ہم سب محسوس کرتے ہیں۔ ان پر جو کیفیتیں گذریں اور گذرتی ہیں، انہیں بے تکلّف شعر کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔" اس مجموعے میں شاعر نے حمد و نعت کے علاوہ "مردِ مسلمان" سے خطاب کرتے ہوئے قومی نظمیں لکھی ہیں۔ نفسِ مضمون ملّت کی نکبت و ناداری اور زر پرستوں کی لوٹ کھسوٹ ہے۔ کچھ نظمیں نوجوانوں سے مخاطب ہو کر لکھی گئی ہیں

اُٹھ کھڑا ہو نوجوان، ہشیار ہو اے شیرِ نر
قوم تیری منتظر ہے، تُو ہے اُس کا منتظر

چند نظمیں مزدوروں کی بیداری پر بھی ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ خورشید خاور صاحب ایک حسّاس نوجوان ہیں، اور کسی نوع کی نظریاتی یا سیاسی وابستگی کے بغیر انسانوں کے ادبار، استحصال، بے حسی اور غفلت شعاری کے مظاہر جہاں بھی دیکھتے ہیں، اس پر اظہارِ افسوس کئے بغیر نہیں رہتے۔ یہی دردمندی ان کی شاعری کا حاصل ہے۔

جو شہر اُن کے دَم سے نگاراں ہے آج کل
خاوَر کے واسطے وہی زنداں ہے آج کل
ہر موڑ پہ حیات کی دیکھی ہے کشمکش
ہر مرحلے پہ موت ہی رقصاں ہے آج کل
چل کر کسی امیر کی کوٹھی پہ دیکھئے
مزدُور کے لہُو سے چراغاں ہے آج کل

میں پختہ مکان ڈھونڈتا ہوں اور پناہگاہ ڈھونڈتا ہوں — سمندر کی لہروں سے بچنے کی جگہ ڈھونڈتا ہوں، اور جب طوفان چلا جاتا ہے۔ تو اپنے گھر کے ویران کھنڈر تلاش کرتا ہوں اور اپنی تباہ فصلیں دیکھتا پھرتا ہوں اور اپنے پیاروں کی لاشیں تلاش کرتا ہوں۔

ہر طوفان کے بعد کچھ نہیں ملتا۔ اخباروں میں بیان ضرور ملتے ہیں۔ ہمدردی اور تعزیت کی قراردادیں بھی ہوتی ہیں اور لیڈروں کے سرخ و سپید چہرے بھی ہر بیان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ جن پر عجیب سی شفقت آمیز مسکراہٹ نمایاں ہوتی ہے۔

اس مسکراہٹ کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے۔ جیسے میں اس گلہ کی ایک بھیڑ ہوں جس کے رکھوالے کتے کی ایک مادہ بھیڑیے سے دوستی ہوگئی تھی یا شاید حالات اس سے بدتر ہوں

میں ظلم، لوٹ، بیماری، افلاس اور ذلّت کا ایک ایسا اعلان نامہ ہوں جس پر اس ملک کے حکمرانِ مطلق نے دستخط کئے۔ اور جسے تاریخ نے اپنے دامن میں محفوظ کر لیا ہو۔ میں نفع اندوزی اور عوام دشمنی کے ظالمانہ نظام کا تاریک ترین لمحہ ہوں

میں صرف ان لوگوں کی لاش نہیں ہوں جو میرے اردگرد میلوں تک بکھرے پڑے ہیں۔ بلکہ میں ان حکومتوں کی بھی لاش ہوں جن پر میری زندگی کی حفاظت فرض تھی۔ اور جنہوں نے مجھ سے اور میرے دیس کے لٹنے والوں سے غداری کی۔ آپ لوگ جب مجھے دفن کریں گے تو میرے ساتھ وہ لاشیں بھی دفن کر دیں جو میری نہیں ہیں میرے دشمنوں کی ہیں۔

لیکن یہ صرف ایک رُخ ہے، اس کا دوسرا رُخ بھی ہے اس لئے کہ میری موت انسانی اخوت، عالمگیر ہمدردی اور دنیا بھر کے عوام کی یکجہتی کی لازوال مظہر بھی ہے۔

جتنی تیزی سے پوری دنیا کے عوام نے میری تباہی اور بربادی پر اپنے ردِّ عمل کا اظہار کیا وہ بجائے خود مستقبل میں دنیا بھر کے عوام کے اتحاد کا ایک روشن اشارہ ہے۔ دنیا بھر کے عوام اگر میری بحالی کے لئے آپ یکا کر سکتے ہیں تو یقیناً مجھے تباہی سے بچانے کے لئے بھی متحد ہو سکتے ہیں۔

میں نے سمندر کا سارا زہر پی لیا ہے۔

میں ایک لاش ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ طوفان سے ہلاک ہونے والوں میں آخری لاش ہوں۔ میں نے انسانی عزم و ارادہ کو جھنجھوڑ دیا ہے اور اب بڑے سے بڑا طوفان بھی انسان کے عزم کو شکست نہیں دے سکے گا۔

کیونکہ میں عوام ہوں اور عوام اس کائنات کی انتہائی طاقت ہیں۔

جنگ کا دیوتا ہر مہینے ۲۶ ہزار سپاہیوں کا خون مانگتا ہے

امریکی جوانوں کو موت کے جال میں کس طرح پھانسا جاتا ہے

ویت نام کی جنگ نے امریکی فوج میں بحران پیدا کر دیا ہے۔ فوج میں ہر مہینے ۲۶ ہزار جوانوں کی بھرتی کی ضرورت ہے، لیکن غیر معمولی ترغیبات کے باوجود بمشکل ۱۳ ہزار افراد بھرتی ہو رہے ہیں، اور اگر بھرتی کے لئے کانگریس کا ڈرافٹ منظور نہ کیا گیا تو ہر ماہ ۷ ہزار افراد کی بھرتی کم ہو جائے گی۔

آسائشیں زیادہ اور رعائتیں منہ مانگی دی جا رہی ہیں

امریکی نوجوانوں میں فوجی ملازمت سے نفرت اور بیزاری اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ امریکی بحریہ، فضائیہ اور بری افواج کے افسروں کو مجبوراً فوجیوں کے لئے مزید سہولتیں فراہم کرنے پر توجہ دینی پڑی ہے۔

اس وقت فوجی نظم وضبط کی حالت ابتر ہے۔ عام فوجی اپنی شکایات اور مطالبات علانیہ پیش کر رہے ہیں، اور اعلیٰ افسر انہیں نظر انداز کرنے کے بجائے انہیں مطمئن کرنے اور حالات کار کو بہتر بنانے کے لئے کوشاں ہیں۔

دو ہفتے پہلے "پرل ہاربر" پر امریکہ کی بحریہ کے چھ سو نوجوانوں کا ایک اجتماع ہوا جس میں عام کیڈٹوں کے علاوہ افسروں نے بھی شرکت کی۔ اس اجتماع میں لوگوں نے اپنی شکایات بیان کیں۔ مثلاً ایک شخص نے اپنے دو ساتھیوں کی اس مشکل کی طرف توجہ مبذول کرائی کہ اس کی ایک رفیقہ کار کی ڈیوٹی دن کی شفٹ پر ہے جب کہ اس کے شوہر کی ڈیوٹی رات کی شفٹ پر ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میاں بیوی کو گوناگوں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا لہٰذا ان کے لئے کچھ کیا جائے۔ افسر متعلقہ ایڈمرل المو زموالٹ نے جو بحری کارروائیوں کے سربراہ ہیں اور امریکی بحریہ میں انقلابی تبدیلیوں کے خواہاں ہیں، وعدہ کیا کہ ان دونوں کو زیادہ آرام دہ فرائض تفویض کئے جائیں گے۔

امریکی بحریہ میں حالاتِ کار کو بہتر بنانے کی مہم کو امریکہ کی بری اور فضائی فوج کے ان احکامات سے مزید تقویت ملی ہے جن میں کہا گیا ہے کہ بری اور فضائی افواج کی ملازمت کو زیادہ پرکشش اور آرام دہ بنایا جائے۔

امریکہ میں فوجی اصلاحات کی یہ تحریک نہ محض اتفاقی امر ہے اور نہ تفتیش کی خاطر کی جا رہی ہیں۔ ان کا عمومی سبب امریکی افواج میں بڑھتی ہوئی بے چینی اور نوجوانوں کا اضطراب ہے اور خاص سبب امریکہ کے مشہور ہفت روزہ "ٹائم" کے بیان کی رو سے ویت نام کی جنگ ہے جس سے امریکی فوج کا وقار خاک میں مل گیا ہے اب عالم یہ ہے کہ جو امریکی فوجی حتیٰ کہ کیڈٹ بھی چھٹیوں پر امریکہ واپس آتے ہیں وہ فوج سے اپنی وابستگی ظاہر کرنا نہیں چاہتے ۱۹۵۵ء کے مقابلے میں فوجی سروس کی شرح میں دوبارہ بھرتی میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ ہر درجے اور شعبہ کے ۲۱ فیصد سابق فوجی دوبارہ فوجی ملازمت کے لئے اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔

فوج کے خلاف نفرت

امریکہ میں فوج گردی کے خلاف بڑھتی ہوئی نفرت اور بیزاری کی وجہ سے یہ خدشہ عام ہے کہ امریکی کانگریس آئندہ سال بحث مباحثہ کے لئے توسیع کا جو مسودہ پیش کرنے والی ہے اس میں توسیع منظور نہیں کی جائے گی۔ پینٹاگان (امریکہ کے فوجی ہیڈ کوارٹر) کے اعلیٰ عہدیداروں کا خیال ہے کہ اگر فوجی ملازمت کے حالاتِ کار کو بہت زیادہ دلکش نہ بنایا گیا تو کانگریس میں سخت مقابلہ ہوگا اس لئے ضروری ہے کہ کانگریس کے آئندہ اجلاس سے پہلے فوجی ملازمت کے حالاتِ کار زیادہ پرکشش بنا دیئے جائیں۔ ان کے خیال میں فوج کے لئے افرادی طاقت حاصل کرنے کا سب سے زیادہ موثر اور واحد ذریعہ سلیکیٹو سروس ہے امریکی وزیر دفاع ملون لیرڈ کے بقول "اس وقت جو سب سے زیادہ اہم مسئلہ ہمیں درپیش ہے وہ افرادی طاقت کے حصول کا مسئلہ ہے لہٰذا ہمیں عوام پر توجہ مبذول کرنی چاہیئے۔ انہیں تمام دوسرے عناصر میں اولیت حاصل ہے۔"

صدر نکسن بھی مسئلہ کی نزاکت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اپنی اس توجہ کو ڈرامائی رنگ دینے کے لئے انہوں نے گذشتہ ہفتہ پانچ سابق فوجیوں کے دوبارہ فوجی ملازمت میں شامل ہونے کی تقریب کی صدارت کی۔ صدر نکسن نے اس بات پر زور دیا کہ افرادی طاقت کے مسئلہ کا طویل المیعاد حل اس صورت میں نکل سکتا ہے کہ فوجی ملازمت کو مزید پرکشش بنایا جائے۔ انہوں نے توقع ظاہر کی کہ متعلقہ مسودہ ۱۹۷۳ء کے بعد نافذ العمل نہیں رہے گا۔ البتہ نئے ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے برقرار رہے گا۔ لیکن اتنی جلد اس کے ختم ہو جانے کے بارے میں فوجی کمانڈروں کو شبہ ہے۔ تاہم اس بات کا امکان ہے کہ فوجی زندگی کو نئی توانائی بخشی جائے جو بہت زیادہ اہم ہے۔

امریکی افواج کے تینوں شعبوں۔ بری، بحری اور فضائی افواج نے اس چیلنج کو قبول کر لیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک سبقت لیجانے کی خواہاں ہے۔ بردست بحریہ سب سے آگے ہے۔ اس کا سہرا ۵۰ سالہ نئے سی این او بڈ زموالٹ کے سر ہے انہوں نے بحریہ میں ایک "عوامی پروگرام" شروع کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ فوجی افراد، ہتھیاروں سے زیادہ قیمتی ہیں۔ انہوں نے پنٹاگان سے خفیہ سمجھوتہ کے ذریعہ اپنے بجٹ میں سے ۲ کروڑ ڈالر حاصل کئے ہیں تاکہ محکمہ دفاع کے تعاون سے چار کروڑ ڈالر میں بحریہ کے افراد خاندان کے لئے نئے مکانات تعمیر کئے جائیں اتنی رقم میں یعنی دو کروڑ ڈالر میں چار تباہ کن جہازوں کے سال بھر کے اخراجات پورے کئے جا سکتے ہیں۔ بحری جہازوں کے مقابلے میں بحری نوجوانوں کو زیادہ اہمیت دینا بحریہ کی تاریخ میں ایک انوکھی بات ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ امریکی جنرلوں کی یہ کوششیں امریکی عوام کو بیوقوف بنانے میں کس حد تک کارگر ہوں گی۔

زموالٹ نے بحریہ کی ملازمت کو پرکشش بنانے کے لئے متعدد احکامات جاری کئے ہیں اور بہت سے فرسودہ احکام منسوخ کر دیئے ہیں۔ وہ امریکی بحریہ کی پرانی اور قدیم روایات کو ختم کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ وہ اب تک کوئی ۶۵ نئے احکامات جاری کر چکے ہیں۔ انہوں نے بحریہ کے افسروں

نوجوانوں کو پھانسنے کے لئے ملازمت میں ترغیبات پیدا کی جا رہی ہیں

کو حکم دیا ہے کہ وہ بحریہ کے عملہ کو بدلتے ہوئے جدید فیشن کے مطابق رکھیں۔ انہوں نے کمانڈروں کو علیحدہ یہ ہدایات بھی دی ہیں کہ وہ صاف ستھری ہلکی داڑھیوں اور تین انچ لمبے بالوں تک اجازت دیدیں۔ انہوں نے یہ حکم بھی منسوخ کر دیا ہے کہ بحری اڈے کے قریب رہنے والے جوان اور جہاز سے اتر کر باہر جانے والے جوان یونیفارم تبدیل کر کے جائیں۔ اب تمام بحری اسٹیشنوں پر موٹر سائیکل لے جانے کی اجازت ہے اور سائیکلوں کے لئے بھی کسی رنگ کی پابندی ختم کر دی گئی ہے۔

زموالٹ نے بحری اڈے پر ڈیوٹی کے بعد شہری لباس پہننے والوں پر سے پابندیاں ختم کر دی ہیں۔ افسروں کو اب یہ آزادی ہے کہ بحری اڈے پر جس قسم کا چاہیں لباس پہنیں۔ اس کے علاوہ جو جہاز واپس آئے اس کے کم از کم نصف عملے کو ۳۰ دن کی چھٹیاں دی جائیں۔ اور جب جہاز سمندر میں ہو تو کم از کم پانچ فیصد عملے کو چھٹی دی جائے جو وہ ساحل پر گذار سکے۔

زموالٹ کا خیال ہے کہ بہت سے افراد اس وجہ سے بحریہ میں شرکت سے کتراتے ہیں کہ اس ملازمت سے اُن کی بیویاں خوش نہیں ہیں۔ اس لئے اس نے ساحل کے تمام کمانڈروں کو حکم دیدیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں بحریہ کے جوانوں اور اُن کی بیویوں کی شکایات سُنیں۔ ہفتے کے دن کام کم سے کم کر دیا جائے بیرکوں اور عملے کا معائنہ اگر کیا بھی جائے تو اس کا اثر اُن کی ہفتہ واری چھٹیوں پر نہ پڑے۔ بیئر بیرکوں میں فراہم کی جائے اور ان بیرکوں میں جہاں کمرے الگ الگ ہیں شراب پاس رکھنے کی اجازت دی جائے۔ زموالٹ نے یہ حکم بھی دیا ہے کہ کسی جوان کو کسی چیز کے حصول کے لئے پندرہ منٹ سے زیادہ قطار میں کھڑا ہونا نہ پڑے۔

ٹیلی فون کالیں مفت ہوں گی

مقامی کمانڈروں کو یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ زموالٹ پروگرام کو مقامی حالات کے مطابق عملی جامہ پہنائیں۔ اس مسئلہ پر مقامی کمانڈر ایکدوسرے سے صلاح ومشورہ بھی کرتے ہیں بعض جگہ انہوں نے داڑھی اور بالوں کی پابندیوں کو اور زیادہ نرم کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک کمانڈر نے ہیر ڈریسر کو مزید تربیت کے لئے بھیجا ہے تاکہ بحریہ کے نوجوان ایک ڈالر میں زیادہ خوبصورت بال بنوا سکیں۔

بحریہ کے نوجوانوں کے لئے ٹیلیفون کی مزید سہولتیں فراہم کی گئی ہیں تاکہ وہ اپنی ضرورت کی اشیاء ٹیلیفون پر طلب کر سکیں۔ ہر جوان کو ہفتہ میں اوسطاً اسی کال مفت کرنے کی اجازت ہے۔

زموالٹ پروگرام کا بحیرۂ روم میں امریکہ کے چھٹے بحری بیڑے کے چالیس جہازوں کے عملے پر بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ اس مرتبہ جان ایف کنیڈی کیریر کے ۴۵۰۰ افراد بڑا دن گذارنے کے لئے طیارے میں وطن جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یو ایس ایس اسپرنگ فیلڈ جہاز کے ۴۰ سے زیادہ پیٹی افسروں کی بیویاں بندرگاہ گٹیا میں جو اس جہاز کا اصل مستقر ہے، بڑی بے چینی سے اپنے شوہروں کا انتظار کر رہی تھیں کیونکہ ان افسروں کو پہلی مرتبہ عارضی قیامگاہ میں اپنی بیویوں کے ساتھ شب بسری کی اجازت ملی تھی۔

نگرانی ختم ہو گئی

امریکی بحریہ کی طرح امریکہ کی بری فوج کو بھی جوانوں کے لئے پرکشش بنانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ چیف آف اسٹاف جنرل ولیم ویسٹ مورلینڈ نے احکام جاری کئے ہیں کہ غیر ضروری طور پر ضابطوں کی تشکیل فوج کے حوصلے پر بُری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ لہذا اس کے زیادہ مواقع فراہم نہ کئے جائیں ویسٹ مورلینڈ نے نظم وضبط کی صورتوں کے علاوہ فوجیوں کی رات کی نگرانی کا سلسلہ ختم کر دیا ہے نیز رات کو باہر جانے اور واپسی کے اندراج کی بھی پابندی ختم کر دی ہے انہوں نے یہ پابندی بھی اُڑا دی ہے کہ جب کوئی سپاہی ڈیوٹی پر نہ ہو تو اپنے کیمپ سے کتنے فاصلے تک جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ شام کے کھانے پر بیر فراہم کی جائے گی بیرکوں میں بیر فراہم کرنے والی مشین لگا دی گئی ہیں۔

اب نوجوانوں کو پھانسنے اور ان کی اہمیت بڑھانے کے لئے نئی نئی تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں فورٹ کارسن کے اڈے پر جہاں چوتھی انفنٹری ڈویژن کے ۲۵ ہزار فوجی تعینات ہیں۔ نوجوانوں کی ہر طرح دلجوئی کی جاتی ہے۔ میجر جنرل راجرز کا کہنا ہے کہ آج کا نوجوان فیصلوں میں شریک ہونا چاہتا ہے وہ فطرتاً متجسّس واقع ہوا ہے وہ ہر بات کی وجہ جاننا چاہتا ہے وہ صرف ایسے جواب سے مطمئن نہیں ہو سکتا جو خوش اعتقادی پر مبنی ہوں یا روایتی ہوں کہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔

کارسن میں اب ہفتہ کے روز صبح کو معائنہ نہیں ہوتا یہاں کے پانچ کلب فوجیوں کو بیئر شراب اور گوگرلز فراہم کرتے ہیں۔ یہاں فوجیوں نے اپنی بیرکوں کو گھروں کی طرح سجایا ہے جن میں رنگین قالین بچھے ہیں اور پردے اور پوسٹر آویزاں ہیں۔

اس سوال کا جواب ابھی قبل از وقت ہے کہ میجر جنرل راجرز نے جو طریقہ کار اختیار کر لیا ہے کیا وہ کامیاب ہوگا البتہ کارسن میں اتنا ضرور ہوا ہے کہ فوج میں دوبارہ شامل ہونے والوں کی تعداد میں تقریباً ۴۵ فی صد اور جونیئر افسروں کی تعداد میں دُگنا اضافہ ہوا ہے

نارتھ کارولینا فورٹ بریگ پر بھی لفٹیننٹ جنرل جان جے ٹولوں کی بھی یہی خواہش اور کوشش ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ آج کا سپاہی ۲۵ سال پہلے کے سپاہی سے زیادہ چاق وچوبند ہے پہلے جس طرح کام چل رہا تھا۔ اس طرح اب کام نہیں چل سکتا۔

یہاں ہفتے کی آخری ٹریننگ نہیں دی جاتی۔ یہاں لمبے بالوں پر بھی کوئی پابندی نہیں کیونکہ لفٹیننٹ جنرل ٹولوں کے بقول بہادری کا تعلق بالوں کی لمبائی سے نہیں ہے۔

نشہ خوروں کا نفسیاتی علاج

امریکہ کی جدید فوج کا مسئلہ سب سے اہم مسئلہ ہیروئن جیسی مہلک منشیات کی عام لت ہے۔ اس اسٹیشن کے فوجی بھی ان چیزوں کے عادی ہو چکے ہیں جو امریکی معاشرے میں عام ہیں پہلے اس سے نجات پانے کا طریقہ یہ تھا کہ انہیں، بے عزت کر کے فوجی ملازمت سے علیحدہ کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اس کا ناگوار اثر یہ ہوتا تھا کہ یہ برائی مُعاشرے میں اور زیادہ پھیل جاتی تھی، لفٹیننٹ جنرل ٹولوں نے اس سے چھٹکارا پانے کے لئے دوسری ترکیب نکال وہ ہر ایسے سپاہی کو جو ان خباثت میں مبتلا ہوتا، میڈیکل سنٹر میں داخل کرتے جہاں اس کا علاج نفسیاتی طریقوں سے کیا جاتا ہے۔

امریکہ کی بری اور بحری فوجوں میں فوجیوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دے کر اور فوجی زندگی کو پُرکشش بنا کر نوجوانوں کو فوجی خدمات انجام دینے کی ترغیب کا سلسلہ فضائی فوج میں بھی جاری ہے۔ یہاں بھی چھٹی کے دن معائنہ کا سلسلہ بند کر دیا گیا ہے اوور ٹائم کے بدلے کارکنوں کو چھٹی فراہم کی جاتی ہے۔ جب ان کا تبادلہ ایک مقام سے دوسرے مقام کیا جاتا ہے تو انہیں اپنے بال بچوں کو لانے لے جانے کے لئے پہلے کے مقابلے میں زیادہ دن دیئے جاتے ہیں

ان تمام کوششوں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا ہے مثلاً بری فوج کی والنٹیئر فوج کم سے کم ۹ لاکھ ہونی چاہئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر مہینہ کم از کم ۲۶ ہزار جوانوں کی بھرتی کی جاتے جس میں پچاس فیصد نئے رنگروٹ ہوں اور پچاس فی صد سابق فوجی لیکن اس وقت مشکل

”حق رائے دہی بھی چاہیئے“

گلگت اور بلتستان تعزیری کیمپ بنے ہوئے ہیں

گلگت اور بلتستان کے ، لاکھ عوام آج اُن حقوق اور مراعات سے بھی محروم ہو گئے ہیں جو انہیں آزادی حاصل ہونے سے پہلے ڈوگرہ راج میں حاصل تھیں۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ کس ”جرم“ کی پاداش ہے۔ وہ ابنائے وطن اور قوم کے رہنماؤں سے یہ سوال پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ کیا وہ پاکستان کے باشندے نہیں جو انہیں ان انسانی حقوق سے بھی محروم کر دیا گیا ہے جو اس سرزمین کے دوسرے بالغ افراد کو حاصل ہیں۔ کیا انہوں نے ڈوگرہ راج سے آزادی اسی لئے حاصل کی تھی کہ وہ اُن حقوق سے بھی محروم ہو جائیں جو دورِ غلامی میں انہیں حاصل تھے۔

پورے پاکستان میں بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات ہو چکے ہیں۔ اس سے پہلے اکتوبر کے مہینے میں آزاد کشمیر میں بھی انتخابات ہوئے لیکن گلگت، بلتستان بشمول ہنزہ اور نگر کے سات لاکھ باشندوں کو نہ آزاد کشمیر کی اسمبلی میں نمائندگی دی گئی اور نہ پاکستان کی قومی اسمبلی میں۔

ان علاقوں کے عام باشندوں کو نہ صرف پاکستان کی کسی نمائندہ اسمبلی میں نمائندگی نہیں دی گئی بلکہ وہاں آج بھی میروں کی مطلق العنان حکومتیں قائم ہیں۔ یہاں کے فرنٹیر کرائمز ریگولیشن جیسے کالے قوانین میں جکڑے ہوئے ہیں۔ گذشتہ ۲۳ سال سے نوکر شاہی اُن کے سروں پر مسلط ہے اور من مانے قوانین کے ذریعہ ان کے استحصال میں مصروف ہے۔ نہ کوئی داد نہ فریاد اگر عوام نے کبھی اپنے مطالبات کے حق میں آواز اٹھائی تو انہیں جیلوں میں بند کر دیا۔ اُس پر بھی اگر عوام چپ نہ ہوئے تو پھر انہیں گولیوں سے بھون دیا گیا۔ آخر یہ ستم کی ڈراؤنی اور کالی رات کب تک ان کے سروں پر مسلط رہے گی۔ کیا بلتستان اور گلگت میں آزادی اور انسانی حقوق کی صبح کبھی طلوع نہ ہو گی؟

گذشتہ ۲۳ سال کے عرصہ میں پاکستان کے تقریباً تمام علاقوں میں تھوڑی بہت ترقی ہوئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی علاقے میں ترقی کی رفتار تیز رہی اور کسی میں سست مگر کوئی ایسا بدقسمت علاقہ نہیں ہے جو تھوڑی بہت ترقی نہ ہوئی ہو سوائے گلگت اور بلتستان کے۔ گذشتہ ۲۳ سال کے عرصے میں ۱۰ کروڑ روپے کا جو حشر ہوا وہ یہاں کے عوام پر روشن ہے۔ اگر اس رقم کا ۳۰ فیصد حصہ بھی یہاں کی ترقی پر خرچ کیا جاتا تو اس علاقے کی کایا پلٹ جاتی یہی وجہ ہے کہ اِن علاقوں میں ندی نالوں کا پانی وافر مقدار میں موجود ہے اس کے باوجود ریگستان آباد نہ ہو سکے یہاں کوئی فیکٹری یا کارخانہ نہیں لگایا۔ اسپتالوں اور اسکولوں کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے اور جب سکول نہیں تو کالج کہاں سے ہوں گے۔

اندوہناک افلاس

گلگت اور بلتستان پہاڑی علاقے ہیں۔ راستے پُرخطر اور دشوار گذار ہیں۔ لیکن یہاں سڑکوں کی حالت بہتر بنانے پر مطلق توجہ نہیں کی گئی اس وقت حالت یہ ہے کہ راستہ چلتے ہوئے خوف آتا ہے۔ پاکستان کے دوسرے علاقوں میں علم کی روشنی پھیل رہی ہے، صنعت و حرفت کی راہیں کھل رہی ہیں۔ زراعت ترقی کر رہی ہے، لوگوں کو سماجی، سیاسی اور انسانی حقوق حاصل ہو رہے ہیں۔ لیکن گلگت و بلتستان میں پسماندگی غربت اور افلاس کے اندھیرے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ آخر ہم اس صورتحال کو کب تک برداشت کریں یا تو یہ کہہ دیا جائے کہ ہمارا تعلق اس پاکستان سے نہیں ہے۔ جو قائداعظم نے تمام مسلمانوں کے لئے بلاامتیاز رنگ و نسل و مذہب و علاقہ قائم کیا تھا اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ ہمارا علاقہ پاکستان کا جزو لاینفک ہے اور ہم بھی پاکستانی قوم کے قابلِ فخر فرزند ہیں تو پھر ہمارے ساتھ یہ غیر انسانی سلوک کیوں روا رکھا جا رہا ہے۔ کیا اس لئے کہ ہم نے سب سے پہلے ڈوگرہ راج کے خلاف تلوار اٹھا کر آزادی کا اعلان کیا اور پاکستان کی جڑیں مضبوط و مستحکم کیں اور پاکستان کی حدود کو توسیع بخشی۔

ہم اپنے حقوق کے لئے آواز اٹھاتے ہیں تو کوئی سننے والا نہیں۔ گلگت، بلتستان، ہنزہ اور نگر میں جاگیردارانہ اور شخصی حکومت قائم ہے۔ یہاں جاگیردار کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ حال ہی میں جب محاذ رائے شماری کے ممتاز اور محب وطن لیڈر اپنے بھائیوں کے تحفظ کے لئے گلگت گئے تو انہیں گرفتار کر کے گلگت کے حدود سے باہر لے جا کر چھوڑ دیا گیا۔ دوسری مرتبہ یہ لوگ جب پھر گلگت پہنچے تو انہیں زبردستی جہاز میں ڈال دیا گیا اور ایک ممتاز رہنما امان اللہ خاں کو بغیر وارنٹ کے گرفتار کر لیا گیا۔ اُن کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ اس علاقہ کے ایک باشعور اور محب وطن باشندے ہیں بتائیے کہ ہم اپنے مظالم کی داستان کس کے سامنے پیش کریں اور کس سے انصاف طلب کریں۔ ریزیڈنٹ بہادر خود ایک فریق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پولیس کا ڈی۔ آئی۔ جی۔ مقامی انتظامیہ کا سربراہ ہے اور ہائیکورٹ کا واحد اور چیف جسٹس بھی ہے۔

تمہیں قاتل، تمہیں شاہد، تمہیں منصف ٹھہرے
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

ستم بالائے ستم یہ ہے کہ انتظامیہ کے فیصلوں کے خلاف کہیں اپیل بھی نہیں ہو سکتی۔ ان حالات میں انصاف کے تقاضے کیسے پورے ہو سکتے ہیں۔

بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہو گی کہ چند سال پہلے یہاں کے عوام پر اس وقت اندھا دھند گولیاں چلائی گئیں جب وہاں کے عوام اپنی فریاد مقامی افسروں تک پہنچانے کے لئے روانہ ہوئے۔ ۱۶۱ افراد ان گولیوں کا نشانہ بنے۔ اس واقعہ کی تحقیقات آج تک نہیں ہوئی۔ بجائے اس کے کہ مقتولین کے ورثا کی اشک شوئی کے لئے انہیں معاوضہ یا خون بہا دیا جاتا الٹا جھوٹے الزامات میں انہیں پھنسا کر بھاری جرمانے اور سزائیں دی گئیں۔

مختصر یہ کہ گلگت اور بلتستان ایک تعزیری کیمپ بنا ہوا ہے اور عوام مظالم کی چکی میں پس رہے ہیں۔

پچھلے دنوں مرکزی حکومت نے عوامی مطالبے کے پیش نظر ایک مشاورتی کونسل بنائی ہے لیکن اس مشاورتی کونسل سے عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا بلکہ ان کی پاؤں کی زنجیریں اور زیادہ بھاری ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

نجات کی واحد صورت یہ ہے کہ

۱۔ حق رائے دہی کی بنیاد پر پاکستان یا آزاد کشمیر کی اسمبلیوں میں یہاں کے عوام کو نمائندگی دی جائے۔
۲۔ ایجنسی نظام اور ایف سی آر ختم کیا جائے۔
۳۔ ہنزہ اور نگر سے شخصی راج کا خاتمہ کیا جائے، اور
۴۔ گلگت اور بلتستان بشمول ہنزہ اور نگر میں آزاد عدلیہ کا قیام عمل میں لایا جائے۔

۱۳ ہزار افراد بھرتی ہو رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ شرح کو کم از کم دگنا کیا جائے اندیشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اگر بھرتی کے لئے کانگریس کا ڈرافٹ منظور نہ کیا گیا تو ہر ماہ کم از کم ۲ ہزار افراد کی بھرتی کم ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں مسئلہ اور بھی نازک ہو جائے گا۔

عام انتخابات کے نتائج

بائیں بازو کے لئے دعوتِ عمل

صاحبِ مضمون نے ان سطور میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات پر تبصرہ کرتے ہوئے، نیشنل عوامی پارٹی کے مختلف گروہوں اور پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کے ماضی وحال سے بحث کی ہے۔ ادارہ کا ان خیالات سے اتفاق رائے ضروری نہیں۔ وہ اصحاب جو اختلاف رائے رکھتے ہیں ان صفحات پر اپنے خیالات کا بے تکلف اظہار کر سکتے ہیں (ادارہ)

علی امجد جعفری

پاکستان کے پہلے عام انتخابات اور اسکے نتائج پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی بہت کچھ لکھا جائے گا۔ پاکستان کی ۲۳ سالہ تاریخ کو ابھی تک مارشل لاء کے پہلے اور مارشل لاء کے بعد یا "ایک ــــــ سے دوسرے مارشل لاء تک" کے درمیانی زمانوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اب شاید کچھ عرصہ تک پاکستان کی حالیہ تاریخ کو دو ابواب میں تقسیم کیا جا سکے گا عام انتخابات کے پہلے اور عام انتخابات کے بعد۔

پاکستان کی تاریخ سے وابستہ یا تو ۴۶ء کے انتخابات تھے۔ جبکہ غیر منقسم ہندوستان کی مسلم رائے عامہ نے پاکستان کی بنا ڈالی یا پھر ۱۹۷۰ء کے انتخابات ہیں، جب پاکستانی قوم نے اپنے سیاسی شعور کا ایسا پختہ ثبوت فراہم کیا جس کے آگے دوست حیران اور دشمن ششدر رہیں، پاکستان کے پرانے راہبرانِ سیاست نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ملک کے عوام ابھی اسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں وہ قیام پاکستان کے وقت کھڑے تھے۔ بعضوں نے اپنی بساطِ سیاست اسی مفروضے پر بچھائی تھی کہ اگر پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا تو پھر اسلام پسندی کے نعرے کی بنیاد پر انہیں مزید پانچ سال تک اس ملک پر حکومت کرنے کا اختیار حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ پرانے مسلم لیگی قائدین نے سوچا تھا کہ لوگوں کو ایوبی آمریت کے دن تو یاد ہوں گے مگر مارشل لاء کے پہلے کی نام نہاد جمہوریت کا مکر و فریب یاد نہیں ہوگا اور نہ یہ یاد ہوگا کہ اس زمانے میں بھی اسلام کا لبادہ اوڑھ کر جمہوری حقوق کا کس طرح گلا گھونٹا گیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء کے آئین کی بحالی۔ تین سو تیرہ علماء کا فتوئ کفر، یوم شوکتِ اسلام، سوشلزم کا مطلب کفر والحاد۔ سوشلسٹوں کی موت کا دن آپہونچا۔ ماریں گے مر جائیں گے اسلامی نظام لائیں گے۔ انڈونیشیا کی تاریخ دہرائیں گے۔ سارے نظریئے اور نعرے اور اسلام پسندی کی اصطلاح، جس کی تشکیل میں جماعتِ اسلامی نے بڑی کاوش کی تھی اُن تمام جماعتوں نے اوڑھ لی جو جمہوریت کی بحالی کے نام پر ملک میں ۱۹۵۸ء سے پہلے کے حالات واپس لانا چاہتی تھیں، جو ملک کے معاشی نظام میں ہر ترقی پسند تبدیلی کی مخالف تھیں جو مغربی پاکستان میں جاگیردارانہ نظام پر آنچ بھی آنے نہیں دینا چاہتی تھیں اور سرمایہ داروں کے اختیارات پر معمولی پابندی کی بھی مخالف تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جاگیرداری اور اجارہ داری کے خاتمہ کے ہر ابتدائی مطالبہ کو الحاد اور اشتراکیت قرار دے کر ایسی دہشت پیدا کی گئی گویا پاکستان پر تباہی کا یقینی خطرہ منڈلا رہا ہے۔ سامراجی، جاگیردارانہ اور اجارہ دارانہ استحصال کے خاتمہ کی اس ابتدائی تحریک کی مخالفت جس شدت سے کی گئی، اور محنت کش عوام کی ہر جد و جہد کو جس قدر نفرت سے دبایا گیا، جبکہ ملک جمہوریت کی بحالی کا آغاز کر رہا تھا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ رجعت پرست طاقتیں اپنے اقتدار میں کسی قسم کی مداخلت برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اب جے بنگلہ کا نعرہ پاکستان سے انکار کے مترادف نہیں رہا

قوم پرست عناصر کی کامیابی

مغربی پاکستان کے معاشرتی اور اقتصادی ڈھانچہ میں ہر ترقی پسند تبدیلی کا مطالبہ اگر ان "اسلام پسندوں" کی نظر میں کفر و الحاد ٹھہرا تو مشرقی پاکستان میں علاقائی خود مختاری کا نعرہ نظریہ پاکستان سے غداری کے مترادف قرار دیا۔ جماعت اسلامی جس نے ان عام انتخابات میں رجعت پرست طاقتوں کی نظریاتی رہنمائی اور "ہراول دستہ" کا کام کیا تھا، سوشلزم اور سیکولرزم کو اپنا دشمن نمبر ایک قرار دیا۔ انتخابات کے نتائج کے فوراً بعد ٹیلیویژن پر جماعتی طلباء اور اساتذہ نے اپنی تقریروں اور تبصروں میں یہ کہنے سے گریز نہ کیا کہ "ان انتخابات میں علاقائی اور صوبائی منافرت نے اور لسانی ذہنیتوں نے بڑا کردار ادا کیا ہے۔"

ملکی انتخابات خصوصاً مشرقی پاکستان کے انتخابات کے نتائج سے پاکستانی قوم کے ایک نئے قومی شعور کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک ایسی پاکستانی قوم جس کی تشکیل میں بنگالی، پنجابی، سندھی بلوچی اور پٹھان قومیتوں کا برابر کا حصہ ہے اور جہاں ہر پاکستانی خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو، عیسائی ہو یا بودھ برابر کا پاکستانی شہری ہے۔ آج تک ہمارے حکمرانوں اور رجعت پرست جماعتوں کی نظر میں "جے بنگلہ" کا نعرہ پاکستان سے غداری اور "نظریہ پاکستان" سے بغاوت کے مترادف تھا۔ مگر پہلی بار جب مشرقی پاکستان میں انتخابی کامیابی کے بعد عوام نے بیساختہ "جے بنگلہ" اور "جے پاکستان" کے نعرے لگائے تو مغربی پاکستان

> انتخابات میں، ایک نیا قومی شعور بروئے کار آیا ہے

سندھ میں صوبائی خود مختاری کی تحریک کے منتشر ہونے کے اسباب میں شاید سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ یہاں اس تحریک کی باگ ڈور جاگیردارانہ عناصر کے ہاتھ میں رہی

کے بہت سے لوگوں کو یہ احساس ہوا کہ "جے بنگلہ اور جے پاکستان" متضاد نعرے نہیں بلکہ ایک دوسرے کے تکمیلی نعرے ہیں شاید ان انتخابی نتائج سے بہت سے لوگوں کی سمجھ میں بھی یہ بات آجائے کہ اگر پاکستانی قوم کی بنگالی، پنجابی، سندھی، پٹھان اور بلوچ شخصیتیں تسلیم نہیں کی جائیں تو پھر پاکستانی قومیت کا تصور بھی پروان نہیں چڑھ سکتا۔ اور یہ کوئی کم بڑی بات نہیں ہے کہ اب مغربی پاکستان میں، مشرقی پاکستان کے عوام کے مطالبۂ خود مختاری کو ہندوؤں کی چال اور ہندوستان کی سازش کہہ کر مسترد نہیں کیا جاتا اور نہ اب یہ بات کہنے کی کسی میں ہمت ہے کہ عوامی لیگ اور شیخ مجیب الرحمٰن کی اکثریت اور مقبولیت بنگالی ہندوؤں کی مرہونِ منت ہے۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی انتخابی کامیابی۔ جسکی "اسٹیم رولر" اکثریت کی مثال دنیا کی انتخابی تاریخ میں مشکل سے ہی ملتی ہے، پاکستان کے ایک نئے قومی شعور اور سیکولر قومیت کے تصور کی کامیابی ہے سیکولرزم کو لادینیت کہہ کر بدنام کیا گیا ہے اگرچہ اس کا صریح مفہوم صرف یہ ہے کہ ریاست مذہب کے معاملے میں غیر جانبدار ہو اور ہر پاکستانی بلا تفریق مذہب وملت مساوی شہری حقوق کا مالک ہو۔ اس کا مطلب "پانچ پاکستان" نہیں بلکہ پاکستان کی مشترکہ قومیت کی پانچ واضح شاخیں ہیں۔ اس تصور کو علاقائی یا صوبائی خود مختاری کی بنیاد پر دستور کی شکل دینا تو قومی اسمبلی کا کام ہے مگر عوام اور خصوصاً مشرقی پاکستان کے عوام کا فیصلہ واضح طور پر سامنے آچکا ہے۔

مغربی پاکستان میں علاقائی خود مختاری کی تحریکیں مقابلتاً کمزور ثابت ہوئی ہیں مگر صوبۂ سرحد اور بلوچستان میں وہ خاصی طاقتور ہیں۔ سندھ میں صوبائی خود مختاری کی تحریک کے منتشر ہونے کے اسباب میں شاید سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ یہاں اس تحریک کی باگ ڈور جاگیردارانہ عناصر کے ہاتھ میں رہی جن کی "جئے سندھ" تحریک نہ تو عوام کو معاشی انصاف کے لئے اکٹھا کر سکی اور نہ یہاں کے پرانے اور نئے سندھیوں کے اتحاد کی کوئی بنیاد فراہم کر سکی۔ خود صوبۂ سرحد اور بلوچستان میں اس کی کمزوری ان علاقوں میں جاگیردارانہ اثرات کے استحکام کا ثبوت ہے۔ اس کے باوجود مجموعی طور پر عام انتخابات کے نتائج کے ان پہلوؤں کو مغربی پاکستان میں بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

سندھ اور پنجاب میں پیپلز پارٹی کی کامیابی مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی کامیابیوں کی ہم پلہ تو نہیں مگر اپنی جگہ فیصلہ کن ہے۔ مغربی پاکستان میں اخبارات، ریڈیو، ٹیلیویژن اور تمام رجعت پرست جماعتوں کے ساتھ ساتھ بعض اربابِ اقتدار نے بھی پیپلز پارٹی کو اپنا نشانہ بنایا تھا، پیپلز پارٹی اور بھٹو کی اپنی جیدار انتخابی مہم کا محور، سامراجیت اور اجارہ داری کی مخالفت، سماجی انصاف، مزدوروں، کسانوں اور محنت کش عوام کی حق رسی اور ہندوستان کے ساتھ تقابل کا نعرہ تھا۔ ایوبی آمریت کے آخری دنوں اور انتخابی مہم کی ابتدا میں پیپلز پارٹی اور مسٹر بھٹو کی توجہ زیادہ تر معاہدہ "تاشقند" اور ہندوستان کے ساتھ مخاصمت اور مقابلہ پر مرکوز تھی مگر جیسے جیسے دن گزرتے گئے عوام کے مسائل اور مطالبے مرکزِ توجہ ہوتے گئے۔ بائیس خاندانوں کی اجارہ داری کا خاتمہ، بنکوں اور انشورنس کمپنیوں کو اور بنیادی صنعتوں کو قومیانے کا نعرہ اس قدر مقبول ہوا کہ سوشلزم کی مخالف جماعتوں کو بھی کسی نہ کسی شکل میں اور کسی نہ کسی حد تک اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ جماعتِ اسلامی جو تحدید ملکیت کو غیر شرعی سمجھتی تھی اب "ناجائز طریقے سے حاصل کی گئی" جاگیرداریوں کے خاتمہ کی حامی ہوگئی۔ "سرمایہ داری اور استحصال کا خاتمہ" ان جماعتوں کا بھی نعرہ بن گیا جو ذاتی ملکیت کے تصور کو اسلام کا بنیادی اور مقدس اصول گردانتی تھیں۔

پیپلز پارٹی کی کامیابی کا سبب

پنجاب اور صوبہ سندھ میں عوام کی کثیر تعداد نے پیپلز پارٹی کو اپنے اعتماد کا مستحق اس لئے سمجھا کہ اسلامی سوشلزم کا نعرہ اُن کے لئے سماجی انصاف کا نعرہ تھا۔ استحصال کے خاتمہ کا نعرہ تھا، مزدوروں، کسانوں اور محنت کش عوام کے حقوق کی بحالی کا نعرہ تھا۔ اب نہ اسلام کو کوئی "خطرہ" لاحق رہا نہ اسلام کے تحفظ کے نام پر کوئی عوام کو دھوکہ دینے کے لائق رہا۔ اب عوام نے مغربی پاکستان میں بھی یہ بات طے کر دی کہ پاکستان کی سیاست کا فیصلہ ٹھوس معاشی حقائق اور سیاسی اور معاشرتی سوالوں کی بنیاد پر ہوگا۔ اب لوگ، اسلام کے تحفظ سے مطمئن ہوکر ان مسائل پر سنجیدگی سے غور کر سکیں گے کہ ملک کی معیشت کی تعمیر نو کیسے کریں، زرعی اصلاحات کی نوعیت کیا ہو، زمینداروں، وڈیروں اور اجارہ داروں کے استحصال پر کس طرح پابندی لگائی جائے، عوام کے بنیادی حقوق کیا ہوں، ملک کس نہج پر ترقی کرے اور اقوام عالم کے درمیان اپنے خوشحال مستقبل کی تعمیر کس طرح کرے۔

عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی

نعروں اور انتخابی مہم کے شور شرابوں سے ہٹ کر عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کے پروگرام اور الیکشن مینی فیسٹو پر نظر ڈالی جائے تو ان دونوں میں اقتصادی پروگرام کی یہ قدریں مشترک ملیں گی

(۱) مخلوط معاشی نظام جہاں عوامی ملکیت کے ساتھ ساتھ نجی ملکیت کے ادارے اپنے اپنے دائرۂ کار میں موجود ہوں گے۔

(۲) معیشت کے کلیدی شعبے مع بنک اور انشورنس قومی ملکیت میں لے لئے جائیں گے۔

(۳) زمین کی ملکیت کی حد قائم ہوگی۔

(۴) صنعتوں میں اجارہ داری اور کارٹل وغیرہ کا خاتمہ کیا جائے گا۔

(۵) چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی خاص طور پر مدد کی جائیگی وغیرہ وغیرہ۔

عوامی لیگ نے یہ صریح وعدہ کیا ہے کہ ۲۵ بیگہ تک کی اراضی پر لگان معاف کر دی جائے گی اور پیپلز پارٹی نے پچاس سے ایک سو پچاس ایکڑ زمین کی حد بندی کا مطالبہ کیا ہے۔ مگر رعیتوں کے حقوق کے بارے میں جہاں پیپلز پارٹی کا منشور خاموش ہے وہاں عوامی لیگ کا منشور جاگیرداری زمینداری اور سرمایہ داری نظام کے خاتمہ کے بارے میں زیادہ دوٹوک بات کہتا ہے۔

یہ عوامی لیگ یا پیپلز پارٹی کے پروگرام یا انتخابی منشور کے تنقیدی جائزے کا محل نہیں بلکہ اس کا ذکر بھی محض اسلئے ضروری ہے کہ ہم انتخابات کے ہنگاموں سے قطع نظر اس تحریک کے کردار کا صحیح تعین کر سکیں جو مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کی سرکردگی میں اٹھی اور انتخابات میں اپنے اپنے علاقوں میں طوفان بن کر چھا گئی۔ نہ صرف پروگرام اور منشور کے نقطۂ نظر سے بلکہ محرکات اور ان طاقتوں کے مدنظر جو ان جماعتوں کی حمایت

ولی نیپ، دشمنوں سے بچنے کی کوشش میں کسی کو دوست بھی نہ بنا سکی

میں کارفرما ہیں۔ یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ — یہ دونوں جماعتیں اور ان کی تحریکیں، ترقی پسند محرکات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جو سامراج، اجارہ داری اور جاگیرداری کی مخالف ہیں۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اگر مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کا مخالف سامراج پہلو کچھ کمزور نظر آتا ہے تو مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کا مخالف جاگیردار رجحان بھی کمزوری او تذبذب کا شکار نظر آتا ہے۔

مجموعی طور پر عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی دونوں کے پروگراموں پر اشتراکیت کی کم و بیش اتنی ہی چھاپ موجود ہے جتنی بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ان تمام پسماندہ ملکوں کے بڑھتے ہوئے "قومی سرمایہ داروں" کی جماعتوں پر اس کی چھاپ موجود ہوتی ہے جو پرانے اور طاقتور سامراجی ملکوں کے مقابلہ میں تیز رفتار صنعتی ترقی کی خواہاں ہیں۔ بھٹو اور مجیب کی جس سوشلزم کا ہوا پاکستان کی رجعت پرست طاقتوں نے کھڑا کیا ہوا تھا، وہ جواہر لال نہرو اور صدر ناصر کی سوشلزم سے کچھ پیچھے ہی ہے آگے نہیں۔ بھٹو نے اپنی سوشلزم کی مثال انگلینڈ کی لیبر پارٹی سے دی تھی۔ "سوشل ڈیموکریسی" یا سماجی جمہوریت کا پروگرام یقیناً ترقی پسندانہ ہے مگر یہ غلط فہمی اگر پہلے ہی دور ہو جائے تو اچھا ہے کہ اسے مارکس یا لینن یا ماؤ کی سوشلزم سے کوئی خاص سروکار ہے یا ان تحریکوں کو مزدور یا محنت کش طبقہ کی نظریاتی قیادت حاصل ہے بلکہ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ محنت کش طبقہ ان جماعتوں کی قیادت میں شریک ہے۔ ہم ابھی تک انتخابات کے نتائج کے بارے میں اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ان دو قومی جماعتوں کی کامیابی پاکستان کے دونوں حصوں میں ایک نئی منزل کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ رجحانات، ترقی پسند، صحت مند، جمہوری، قوم پرور اور عوامی ہیں جن سے ایک باشعور، طبقاتی اور واضح اشتراکی تبدیلیوں کے لئے راہیں ضرور کھلتی ہیں — مگر یہ خود اشتراکی انقلاب کی آئینہ دار نہیں ہیں۔

بائیں بازو کا انتشار

پاکستانی سیاست کے اس نئے موڑ پر جبکہ عوام نے رجعت پرست سیاسی اور نیم مذہبی جماعتوں کو واضح طور پر مسترد کر دیا ہے اور ان کی حیرانی اور پریشانی کا یہ عالم ہے کہ وہ عوام کے پست سیاسی اور ذہنی شعور کو کوسنے پر اتر آئے ہیں، دوسری طرف روایتی بائیں بازو کی ذہنی پراگندگی اور انتشار بھی کچھ کم نہیں ہے۔ بائیں بازو کی پرانی جماعتوں میں صرف ولی خاں کی نیشنل عوامی پارٹی قومی اسمبلی میں چھ نشستیں حاصل کر سکی اور صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں صوبہ سرحد اور بلوچستان میں سب سے بڑی جماعت بن کر ابھر سکی۔ بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی نے مشرقی پاکستان کے انتخابات میں سرے سے حصہ ہی نہیں لیا اور مغربی پاکستان میں جہاں کہیں اس کے امیدواروں نے انتخابات میں حصہ لیا وہاں "اسلام پسندوں" اور پیپلز پارٹی کی کشمکش میں اس کی حالت دگرگوں ہو گئی۔

انتخابات کے نتیجے کے طور پر بائیں بازو کی پرانی اور روایتی جماعتوں کو اس ناکامی کا جائزہ لینا اس لیے بہر حال ضروری ہے کہ عوامی تحریکوں کا رجحان آئندہ کونسا رخ اختیار کریگا اور عوام کی انتخابی کامیابیاں بائیں بازو کے رجحانات کو مزید آگے لے جا سکیں گی یا نہیں، اس کا انحصار بڑی حد تک اسی بات پر ہے کہ بائیں بازو کی پرانی جماعتیں اور روایتی اشتراکی عناصر اپنی غلطیوں کی اصلاح کر کے جمہوری تحریک میں اپنا صحیح کردار ادا کر سکیں گے یا ایسا نہیں کر سکیں گے۔

ولی نیپ کا کردار

پاکستان کی سیاست میں روایتی بائیں بازو کے عناصر چار گروہوں میں تقسیم نظر آتے تھے۔ ایک وہ عنصر جس نے ابتداً سے ہی پیپلز پارٹی کا ساتھ دیا اور جسے پیپلز پارٹی کے بانیوں میں گنا جا سکتا ہے۔ دوسرا وہ جو بھاشانی کی رہنمائی میں نیشنل عوامی پارٹی میں شامل رہا ہے بلکہ جسے اس جماعت کی بڑی حد تک قیادت حاصل تھی۔ تیسرا وہ عنصر جو ولی خاں کی نیشنل عوامی پارٹی میں شریک تھا اور چوتھا وہ جو انتخابات سے چند ماہ پیشتر بھاشانی اور نیپ سے الگ ہو کر انقلاب کی ایسی راہوں پر چل پڑا جہاں سے ابھی تک اس کی کوئی خبر نہیں ملی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ منتشر گروہ اور بھی ہیں جو جماعت کی حیثیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

سب سے پہلے ولی خاں کی نیشنل عوامی پارٹی کا ذکر کیا جائے کیونکہ اس جماعت کے اندر انتخابات میں شرکت کے سوال پر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ مشرقی پاکستان میں اس کی قیادت پرانے اشتراکی عناصر کو حاصل تھی مگر مغربی پاکستان میں یہ عناصر نہ ہونے کے برابر تھے۔ پنجاب میں اس کی تنظیم کا وجود برائے نام تھا اور یہی حال سندھ کا تھا۔ نیشنل عوامی پارٹی کی عوامی حیثیت — انتخابات سے بہت پہلے صوبہ سرحد اور بلوچستان تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی یہ حیثیت مقابلتہً نچلی سطح پر — وہی تھی جو مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی تھی یعنی ایک ایسی قومی جمہوری پارٹی کی جس کا مرکزی نعرہ اور مقصد علاقائی یا صوبائی خود مختاری کا حصول تھا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی نے جو کچھ کامیابی حاصل کی وہ بھی انہیں علاقوں میں جہاں اس کی یہ حیثیت مسلمہ تھی۔ دوسرے علاقوں میں جہاں اشتراکی عناصر نیشنل عوامی پارٹی کی قیادت میں نمایاں تھے۔ حسن اتفاق ایسا تھا کہ وہ علاقائی خود مختاری کی تحریک کی قیادت نہ کر سکے۔ مشرقی پاکستان میں کہنے کو تو پروفیسر مظفر کی نیپ کو عوامی لیگ کی "بی ٹیم" کہا جانے لگا یعنی وہ چھ نکات کی حمایت کرتے تھے — مگر قومی تحریک کی حمایت کرنا ایک بات ہے اور قومی تحریک کی قیادت کرنا دوسری بات ہے۔ سندھ میں پرانے اور نئے سندھیوں کے جھگڑوں کے پیچھے دونوں طرف کی رجعت پرست جماعتوں کا ہاتھ تھا اور انہوں نے اس کا فائدہ بھی اٹھایا مگر علاقائی خود مختاری کی خواہش کسی منظم تحریک کی شکل اختیار نہ کر سکی اور نہ اشتراکی عناصر صحت مندانہ بنیادوں پر نئے اور پرانے سندھیوں کا اختلاف دور کرنے میں کوئی مثبت کردار ادا کر سکے۔ پنجاب کی قومی تحریک کا محور معاہدۂ تاشقند اور ہندوستان کا مقابلہ تھا۔ ولی خاں کی نیشنل عوامی پارٹی ان حالات میں پنجاب کے قومی مزاج کی نمائندگی کرنے کی نا اہل تھی جو رہی سہی کمی تھی وہ میاں قصوری اور سب فیڈریشن کے جھگڑے نے پوری کر دی۔

ایک میانہ رو گروہ

نیشنل عوامی پارٹی (ولی گروپ) کی جو تصویر عوام کے سامنے ابھر کر آئی ہے وہ ایک سلجھے ہوئے مگر میانہ رو گروہ کی تصویر ہے۔ مگر اس جماعت میں نہ تو عوامی لیگ کی طرح قومی اظہار خودی کا زور تھا اور نہ سماجی تبدیلی کے لئے پیپلز پارٹی کا سا جوش و خروش۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس جماعت کی کوشش تھی کہ وہ کسی کو اپنا دشمن نہ بنائے اور اس کوشش میں وہ اسی حد تک کامیاب ہوئی کہ وہ کسی کو اپنا خاص دوست بھی نہ بنا سکی۔ اس کا ماضی ایک شاندار جرأت مندانہ مخالف سامراج اور عوامی جمہوری کردار کا حامل ہے۔ سامراج دشمنی اور حصول جمہوریت کی جدوجہد میں یہ کردار عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی دونوں سے کہیں آگے ہے۔ اس کے باوجود پورے پاکستان کے پیمانہ پر ایک تابناک مستقبل کی بنیاد نہیں بن سکا، چونکہ اس کی عوامی بنیاد دو چھوٹے صوبوں کی علاقائی خود مختاری تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اور خود صوبۂ سرحد میں اس تحریک کے وسیع تر ہونے کے لئے جاگیرداری کے خلاف جس شدت کے ساتھ مورچہ لگانے کی ضرورت تھی اس میں کوتاہی برتی گئی شاید نیپ کی لبرل قیادت یہ سمجھتی تھی کہ جاگیرداری کے خلاف

یہ مسئلہ آخر تک طے نہ ہوسکا کہ انتخابات میں شرکت انقلابی تقاضوں کے منافی ہے یا اس سے انقلابی تحریک کو آگے بڑھانے کا کام لیا جاسکتا ہے۔

جدوجہد سے پٹھان علاقائی خود مختاری کا محاذ کمزور ہو جائے گا مگر تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ہوا ٹھیک اس کے برعکس!

بھاشانی نیپ میں شامل اشتراکیوں کا گروہ اور وہ جو پیپلز پارٹی میں شامل تھا، آخری وقت تک یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ انتخابات میں شرکت کی جائے یا نہ کی جائے۔ یہ مسئلہ متنازعہ فیہ بنا رہا کہ انتخابات میں شرکت انقلابی تقاضوں کے منافی ہے یا اس سے انقلابی تحریک کو آگے بڑھانے کا کام لیا جاسکتا ہے پیپلز پارٹی کی ہالا کانفرنس میں اشتراکی گروہ اپنی یہ انقلابی لائن کو منوانے کی ناکام کوشش کرچکا تھا کہ پارٹی کو انتخابات میں سرے سے حصہ ہی نہیں لینا چاہیئے۔ اس کے باوجود انتخابات میں کاغذات نامزدگی داخل کئے گئے اور مقررہ تاریخ سے چند دن پیشتر بعض سرگروہ لوگوں نے انقلابی تقاضوں کے نام پر اپنے نام واپس لے لئے۔ انتخابات سے چند دن پیشتر اس گروہ کے اندر کے ایک گروہ نے کنٹرک ہال کے جلسہ عام میں پیپلز پارٹی کی کراچی لیڈرشپ کے خلاف کھلا اعلان جنگ کردیا۔ اور اس طرح یہ اختلافات اور بھی الجھ کر رہ گئے۔ انتخابات کے سلسلہ میں یہی "جدوجہد" بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی میں بھی ہوئی جس کے نتیجہ میں طٰہٰ نیپ سے علیحدہ ہو گئے مگر باقیوں کا تذبذب بھی آخر تک برقرار رہا۔ یہاں تک کہ مشرقی پاکستان کے طوفانوں کے نام پر مولانا بھاشانی انتخابات سے قطعی علیحدہ ہو گئے مغربی پاکستان نیپ کی طرف سے سی آر اسلم صاحب اور دیگر حضرات نے بہت دنوں تک مزدوروں اور کسانوں کے لئے علیحدہ حلقہ انتخابات کا مطالبہ کیا اور پھر پنجاب اور کراچی کے کئی ایک حلقوں سے جو امیدوار کھڑے کئے گئے وہ پیپلز پارٹی کے طوفان میں بہہ گئے۔

مولانا بھاشانی اور صوبائی خودمختاری

مشرقی پاکستان میں نیشنل عوامی پارٹی مولانا بھاشانی کے زیر قیادت ایک خاصی طاقتور سیاسی جماعت سمجھی جاتی تھی۔ مگر مشرقی پاکستان کے طوفان کے پہلے تک مولانا بھاشانی عوامی لیگ اور مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کی مخالفت کرتے رہے اس کا صوبائی خودمختاری کا نعرہ عوامی لیگ کے مقابلہ میں مشرقی پاکستان کے لئے بہت کم مطالبات کا طلب گار تھا دوسرے مارشل لاء کے بعد ایک عرصہ تک وہ صدر یحییٰ خاں سے مطالبہ کرتے رہے کہ انتخابات سے پہلے صوبائی خودمختاری کا مسئلہ حل کر دیا جائے۔ شاید اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ صوبائی خودمختاری کے سوال کو انتخابات کا متنازعہ فیہ مسئلہ بننے دینا نہیں چاہتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ مارشل لاء کے ذریعہ ہی اس مطالبہ کی حدود طے کردی جائیں ان کی متواتر یہ کوشش رہی کہ عوامی تحریکوں کا رخ خودمختاری کے مسئلہ سے سماجی مسائل کی طرف موڑا جائے مگر یہ کوشش ناکام رہیں اور مشرقی پاکستان کے قومی مطالبے کی علمبردار عوامی لیگ نے انتخابات میں جو کامیابی حاصل کی ہے وہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی کامیابی سے بھی کہیں بڑی ہے تاریخ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ مولانا بھاشانی اور ان کی نیپ جس نے اپنی ساری تاریخ میں خودمختاری کے سوال پر میانہ روی کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی اب جو حقیقت حال سے واقف ہوتی ہے تو اس نے مدتوں کی مسافت یوں ایک چھلانگ میں طے کی ہے کہ اب اسے مشرقی پاکستان کی مکمل آزادی اور علیحدگی سے کم تر کوئی بات قابل قبول نظر نہیں آتی۔

ولی گروپ اور گول میز کانفرنس

نیشنل عوامی پارٹی بھاشانی گروپ کی ناکامی — مشرقی بنگال کے علاقائی قومی مسئلہ کو نہ سمجھ پاتے اور اس سے بے تعلق ہوجانے سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ شائد اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ ایوبی آمریت کے خلاف عوامی تحریک میں اولیت کا سہرا بھاشانی نیپ کے سر نہیں بلکہ عوامی لیگ کے سر ہے اور بھاشانی نیپ ایوبی آمریت کے خلاف عوامی محاذ میں کافی دیر بعد شریک ہوئی ابتدائی دور میں بھاشانی نیپ کے اکثر عناصر اس تذبذب کے شکار تھے کہ شائد عوامی چین سے تعلقات قائم کر کے اور خارجہ پالیسی میں غیر وابستگی کی پالیسی اختیار کر کے ایوبی حکومت کے عوام دشمن کردار میں کچھ تبدیلی آگئی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ولی خاں کی نیپ گرچہ اس طرح کی کسی غلطی کی مرتکب نہیں ہوئی مگر ایوب کی گول میز کانفرنس میں شریک ہو کر وہ ڈیک کی ان بدنام سمجھوتہ پرست جماعتوں کے زمرے میں شریک ہوگئی جن میں سے شاید ایک بھی جماعت انتخابات کے معرکے سے جانبر نہیں ہوسکی ہے۔ تاریخ کے اس دور پر مڑ کر نگاہ ڈالنے سے اب شائد اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ گول میز کانفرنس کی شرکت نے ولی نیپ کے بے داغ ماضی پر سمجھوتہ پرستی کا داغ لگا دیا تھا اور اسے عوامی تمناؤں اور جدوجہد کے تقاضوں کی زیادہ موثر نمائندگی سے روک دیا تھا۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ نیپ کے سوا ڈیک کی ساری جماعتیں، بعد میں اسلام پسندی کے جھنڈے تلے اکٹھا ہوگئیں اور عوام نے انہیں فیصلہ کن طور پر مسترد کر دیا۔ اس مرحلہ پر عوامی لیگ اور شیخ مجیب الرحمٰن کی گول میز کانفرنس کی شرکت ایک دوسرے زمرہ میں آتی ہے چونکہ وہ اگرتلہ سازش کے مقدمے سے براہ راست گول میز کانفرنس کی میز پر پہنچے تھے۔

بے سبب نظریاتی اختلاف؟

یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ پرانے اشتراکیوں کے مختلف گروہ جن عوامی سیاسی جماعتوں میں شریک تھے ان میں سے کوئی بھی جماعت سائنٹفک سوشلزم کی بنیاد پر قائم نہیں تھی۔ ان میں سے ہر ایک جماعت میں مختلف سطح پر ایسے لوگ قیادت میں موجود تھے جنکا محنت کش طبقہ سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ ہر ایک کی نوعیت کم و بیش ایک قومی جمہوری محاذ کی سی تھی مگر پرانے اشتراکیوں نے ان جماعتوں کو جہاں بائیں بازو کا ترقی پسند نقطۂ نظر اختیار کرنے پر آمادہ کیا، وہیں انہوں نے ان جماعتوں کو ان نظریاتی اختلافات میں بھی الجھا دیا جو محض ان کے باہمی اختلافات تھے۔ مثلاً یہ کیسی مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم سے عوام کے بنیادی مسائل کو ان کی اپنی زبان میں سمجھانے کے بجائے "ترمیم پسندی" پر لیکچر دیئے جائیں جب کہ پیپلز پارٹی کے بیشتر رہنما سرے سے سوشلسٹ ہی نہ ہوں۔ یا وہ لوگ جنہوں نے عوامی جدوجہد اور کسانوں مزدوروں کے حقوق کے لئے لڑائی میں ابھی تک حصہ ہی نہ لیا ہو انہیں اچانک ان رازسے آگاہ کیا جائے کہ انتخابات بورژوا طریقۂ کار ہے اور ہتھیاروں کے بغیر حکومت ہاتھ میں نہیں آسکتی۔ یا پھر وہ جماعت جو محنت کشوں کی طبقاتی جدوجہد کی سرے سے قائل ہی نہ ہو، اس میں مزدور طبقہ کی حکمت عملی پر بائیں بازو کے دوسرے گروہوں سے اختلافات نپٹائے جائیں۔

پرانے اشتراکیوں کیلئے یہ ایک لمحۂ فکر یہ ہے کہ جمہوریت اور اشتراکیت کا علم پاکستان کے عوام نے اٹھا تو لیا ہے مگر اس قافلہ کی سرکردگی ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو جمہوریت اور اشتراکیت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ پاکستانی عوام اور پاکستانی قوم کے اس نئے سفر میں پرانے اشتراکی میر کارواں اس لئے نہیں بن سکے کہ انہوں نے فروعی اختلافات کو بنیادی اختلافات کا درجہ دے دیا اور نام نہاد نظریاتی اختلافات کی بھول بھلیوں میں پھنس کر رہ گئے۔

گول میز کانفرنس میں شرکت سے ولی نیپ کے بے داغ ماضی پر سمجھوتہ پرستی کا داغ لگ گیا

مصطفیٰ :

ریلوے مزدور کیا چاہتے ہیں؟

درجہ چہارم کے ملازم، کیا عبوری امداد کے مستحق نہیں؟

گزشتہ ایک ماہ سے لاہور میں ریلوے انتظامیہ اور ریلوے کے تقریباً پچیس ہزار مزدوروں کے درمیان زبردست کشمکش جاری ہے۔ مزدور کام پر تو باقاعدگی سے حاضر ہوتے ہیں مگر اپنے مطالبات منوانے کے لئے انتظامیہ پر دباؤ ڈالنے کی خاطر ہر ایک آدھ دن کے وقفے سے دو تین دن تک کے لیے کام چھوڑ کر بیٹھ رہتے ہیں۔ انتخابات کی گہما گہمی کے باوجود ریلوے مزدوروں کی توجہ اپنے مطالبات سے نہ ہٹ سکی بلکہ انتخابات میں عوامی طاقتوں کی زبردست فتح سے اُن کے حوصلے اور بلند ہو گئے ہیں۔ یاد رہے کہ لاہور میں ریلوے ورکشاپ کا علاقہ اس حلقے میں شامل ہے۔ جہاں سے پیپلز پارٹی کے چیرمین ذوالفقار علی بھٹو کامیاب ہوئے ہیں

ریلوے مزدوروں کی بے چینی کے عمومی اسباب تو وہی ہیں جن سے ملک کے غریب عوام عرصہ دراز سے دوچار ہیں مگر موجودہ ہڑتالیں اس وجہ سے ہو رہی ہیں کہ ریلوے حکام نے درجہ چہارم کے ملازمین کو ابھی تک عبوری امداد ادا نہیں کی۔ ایوب آمریت کے خلاف عظیم عوامی تحریک میں مزدوروں نے فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا جس میں ریلوے کے ہزاروں مزدور برابر کے شریک تھے۔ لہٰذا حکومت نے کم تنخواہ پانیوالے تمام سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے ملازمین کو ملک میں شدید گرانی کے پیش نظر عبوری امداد دینے کا فیصلہ کیا تھا اگرچہ یہ امداد بہت معمولی تھی مگر ریلوے حکام نے اب تک اپنے مزدوروں کو اس کی ادائیگی نہیں کی جب کہ ملک کے دوسرے اداروں میں عبوری امداد مارچ ۱۹۶۹ء سے ادا کی جارہی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ مرکزی حکومت نے نہ صرف سرکاری بجٹ میں مطلوبہ رقم مختص کر دی تھی بلکہ عرصہ ہوا ریلوے انتظامیہ کو عبوری امداد کی ادائیگی کے واضح احکام بھی بھیج دیئے تھے مگر شاید وہ سرکاری چٹھی کسی افسر کی میز کی دراز کے دور دراز کونے میں اٹک کر رہ گئی اور ریلوے حکام نے اس معاملے کو آج تک دبائے رکھا۔ لہٰذا اس کے خلاف مزدوروں نے کئی بار آواز اٹھائی مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

بالآخر ۱۶ نومبر ۱۹۷۰ء کو لاہور ریلوے کی ورکشاپس ڈویژن کے مزدوروں نے آدھے دن کے لئے اوزار چھوڑ ہڑتال کر دی اس پر ورکشاپس کے ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ نے مزدوروں کے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ چار دن کے اندر اندر عبوری امداد کے متعلق حکومت کا پروانہ تلاش کر کے اس کی ادائیگی کا بندوبست کریں گے۔ مگر جب یہ وعدہ پورا نہ ہوا تو انہی مزدوروں نے دوبارہ ہڑتال کر دی اس ہڑتال کے نتیجے میں سرکاری چٹھی تو شاید موصول ہو گئی مگر ریلوے انتظامیہ نے درجہ چہارم کے صرف ۱۳۵ روپے ماہوار تنخواہ پانے والے مزدوروں کو عبوری امداد ادا کرنے کا اعلان کیا اور باقی ستر فیصد مزدوروں کو اس برائے نام امداد سے بھی محروم کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور ناگوار بات یہ ہوئی کہ سرکاری اعلان کے باوجود ریلوے حکام نے مزدوروں کو عید سے پہلے تنخواہ دینے سے انکار کر دیا۔ اسکا شدید ردعمل ہوا اور ۲۶ نومبر کو ریلوے انجن شیڈ کے مزدوروں نے سہ پہر چار بجے ہڑتال کر دی جو رات نو بجے تک جاری رہی۔ اس دوران میں لاہور سے چلنے والی متعدد گاڑیاں پانچ گھنٹے کی تاخیر سے روانہ ہوئیں

تین مطالبات مان لیے گئے

انجن شیڈ کی اس ہڑتال اور اس سے پیشتر ورکشاپس کی ہڑتالوں کے دوران ریلوے پیپلز یونین کا کردار نمائندہ رہا جس نے ہڑتالی مزدوروں کی بھرپور حمایت کی اور ان کی قیادت کی۔ لہٰذا ریلوے کے وائس چیرمین نے پیپلز یونین کے صدر پروفیسر مبارک حیدر کے ساتھ گفت و شنید کی جس کے نتیجے میں مزدوروں کے تین فوری مطالبات تسلیم کر لئے گئے اور ان کا اعلان خود وائس چیرمین کو مزدوروں کے درمیان جا کر کرنا پڑا یعنی یہ کہ تنخواہ عید سے پہلے ادا کی جائے — اور عبوری امداد کے بقایاجات بھی ساتھ ہی ادا کر دیئے جائیں اور ان افسران کے خلاف کارروائی کی جائے جو عید سے پہلے تنخواہ کی ادائیگی میں رکاوٹ ڈالنے کے ذمہ دار تھے البتہ درجہ چہارم کے دیگر ملازمین کو عبوری امداد دینے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا لہٰذا پروفیسر مبارک حیدر کے کہنے پر مزدوروں نے وقتی طور پر ہڑتال ختم کر دی اور عید سے پہلے واجبات وصول کر لیے۔

عید کے بعد ۳ دسمبر کو جب مزدور کام پر آئے تو انہوں نے کام کرنے سے دوبارہ انکار کر دیا تاکہ ۱۳۵ روپے سے زائد تنخواہ پانے والے درجہ چہارم کے باقی ملازمین کے لئے بھی عبوری امداد کا مطالبہ تسلیم کرایا جاسکے۔ نیز ۷ اور ۱۷ دسمبر کو الیکشن کے دن عام تعطیل کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ اس مرتبہ تمام ورکشاپس کے علاوہ پاور ہاؤس اور جنرل سٹور کے ملازمین بھی اس ہڑتال میں شامل ہو گئے جن کی کل تعداد بیس سے پچیس ہزار کے درمیان ہے۔

عمل درآمد نہیں ہوتا

۴ دسمبر کو حکومت نے الیکشن کے دنوں کی چھٹی کا اعلان کر دیا لہٰذا ریلوے انتظامیہ نے ان دنوں کی چھٹی کے علاوہ ۱۵۱ روپے تک تنخواہ پانے والے درجہ چہارم کے ملازمین کو بھی عبوری امداد دینے کا اعلان کیا۔ یاد رہے کہ نئی لیبر پالیسی کے تحت غیر ہنرمند مزدوروں کی تنخواہ لاہور میں ۱۲۵ روپے مقرر کی گئی تھی مگر اس کا اطلاق ریلوے پر نہیں کیا گیا تھا لہٰذا یہاں آج بھی بیشتر مزدوروں کی کم از کم تنخواہ ۶۵ روپے سے شروع ہوتی ہے اور ایک روپیہ سالانہ ترقی کے بعد ۱۵ سال میں اس سکیل کی آخری حد ۸۰ روپے تک پہنچتی ہے آپ اندازہ کریں کہ گرانی کا یہ دور اور ایک روپیہ سالانہ ترقی۔

علاوہ ازیں ریلوے میں ۲۳۰ روپے تک تنخواہ پانے والے ملازمین بھی درجہ چہارم کے ملازمین شمار کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا اب بھی درجہ چہارم کے تمام ملازمین کو عبوری امداد دینے کا مطالبہ حل تو نہ ہوا تھا مگر مزدوروں نے ۵ دسمبر سے کام شروع کر دیا۔ کیونکہ اس طرح کی ہڑتال اگر ۲۴ گھنٹے سے تجاوز کر جاتی تو ریلوے انتظامیہ کو تالہ بندی کا جواز مہیا ہو جاتا۔

اس دوران میں انتخابات ہوئے اور ۸ تاریخ کو جب مزدور کام پر آئے تو انہوں نے پھر کام چھوڑ ہڑتال جاری رکھی۔

عبوری امداد کے اس مطالبے کے علاوہ ریلوے مزدوروں کے کئی مطالبات عرصہ دراز سے تسلیم نہیں کئے گئے ۸ دسمبر کو ریلوے حکام کی درخواست پر وائس چیرمین ریلوے اور پیپلز یونین کے صدر پروفیسر مبارک حیدر کے درمیان پھر مذاکرات ہوئے تو انتظامیہ کا موقف یہ تھا کہ انہیں ۱۵۱ روپے سے زائد تنخواہ پانے والے ملازمین کو عبوری امداد دینے کے لئے مرکزی حکومت سے منظوری لینی ہوگی اور یہ کام بڑا وقت طلب ہے۔ لہٰذا مزدوروں کو صبر سے کام لینا چاہئے۔ مگر مزدور نمائندوں کا موقف یہ تھا کہ مزدوروں کے صبر کی انتہا ہو چکی ہے اور اب تو حکومت کو اپنی مشینری میں تیل دینے کی طرف توجہ دینی چاہیے اور ریلوے مزدوروں کی موجودہ ہڑتالیں حکام بالا کو ان مسائل کے فوری حل کے لئے متحرک کرنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔ چونکہ ریلوے انتظامیہ نے کوئی فیصلہ کرنے سے معذوری کا اظہار کیا لہٰذا یہ بات چیت نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی اور ریلوے حکام اور مزدوروں کے درمیان یہ سرد جنگ ابھی جاری ہے۔ اندیشہ ہے کہ حکام نے اگر مزدوروں کے ان جائز مطالبات کو تسلیم نہ کیا تو یہ ہڑتال مزید پھیل جائے گی۔

مکتوب حیدرآباد: احمد الطاف

رجعت پرستوں کو ضمنی انتخابات میں بھی ناکامی ہوگی

شکست خوردہ لیڈر عوامی لیگ کے پرچم تلے منظم ہو رہے ہیں

اے پی این ایس کے سابق صدر اور عبرت اخبار کے مالک کا انجام بھی عبرتناک ہے

سندھ میں کونسل مسلم لیگ کے کھوکھلے ستون سابق وزیر قاضی محمد اکبر کا حالیہ انتخابات میں جو حشر ہوا وہ بجائے خود ایک درس عبرت ہے۔ قیام پاکستان سے قبل ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر دادو کے حلقہ سے جی ایم سید کو شکست دے کر قاضی صاحب نے نمایاں مقام حاصل کیا تھا اور یہیں سے ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔

قیام پاکستان کے بعد قاضی اکبر کی بن آئی۔ مہاجر نہ ہوتے ہوئے بھی متروکہ املاک پر اُن کا قبضہ ہو گیا۔ حیدر آباد میونسپلٹی کا بجٹ اور وسائل سالہا سال تک اُن کے تصرف میں رہے۔ پھر وہ صوبائی وزیر بن گئے۔ قاضی صاحب کا ستارۂ اقبال ایوبی مارشل لا کے بعد عروج پر آگیا۔ اور وہ دیکھتے دیکھتے خاصے دولت مند اور بارسوخ بن گئے۔ اُن کا نام چڑھتے سورج کے پجاریوں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ پٹرول پمپ سے لے کر سندھ موٹرز کوآپریٹو بنک اور ہوٹل کے مالک و مختار بن گئے۔ عبرت پریس اور اخبار کی ملکیت کے سہارے وہ اخبارات کے مالکان کی انجمن کے قائم مقام صدر ہو کر عامل صحافیوں کے جائز مطالبات کی راہ میں حائل ہو گئے۔ انہوں نے ہر طرف ہاتھ پاؤں پھیلائے اور ایوبی آمریت کی گرتی ہوئی دیوار کو آخری لمحہ تک سہارا دینے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ عوام اور سماجی خدمت کے بجائے انہیں دولت پر بھروسہ رہا۔ لیکن انتخاب میں ہر قسمی سودے بازی، شاطرانہ ہتھکنڈے اور وسائل کے بے دریغ استعمال کے باوجود نیز مہاجر، پنجابی، پٹھان محاذ کے متمول اور با اثر چودھری اشرف کو اپنے حق میں دستبردار کر دینے کے بعد بھی انہیں پیپلز پارٹی کے امیدوار کے ہاتھوں عبرت ناک شکست ہوئی۔ اُن کے بڑے صاحبزادے اور روزنامہ "عبرت" کے مینجنگ ایڈیٹر قاضی سعید کو انتخابات کے دن ایک زنانہ پولنگ اسٹیشن پر بلا اجازت بے جا کر کے متعین عملہ سے جھگڑا کرنے کی پاداش میں قید بامشقت کے علاوہ تین لاکھ روپے جرمانہ کی سزا دی گئی۔ لیکن وہ عوام کی انتخابی فتح کو دعائیں دیں کہ صدر مملکت نے تمام سیاسی قیدیوں کو عام رہائی کا اعلان کر کے انہیں بھی قید اور جرمانہ سے معاف کر دیا۔

قاضی اکبر کے قریبی حلقوں کا کہنا ہے کہ انتخابی بازی میں وہ اپنا بہت کچھ اثاثہ گنوا بیٹھے۔ معلوم ہوا کہ کئی لاکھ روپے کے عوض انہیں اپنا ایک سینما دو برس کے لئے کراچی کی ایک پارٹی کو لیز پر دینا پڑا۔ انہوں نے ڈیڑھ لاکھ کی مالیت کا ایک شہری پلاٹ فروخت کیا بعض زرعی املاک کا بھی سودا کیا اور پھر بھی ایک بنک سے اوور ڈرافٹ کے لئے رجوع کرنا پڑا۔ ان تمام سودے بازیوں کے باوجود وہ جاگے ہوئے عوام کے ذہن اور ضمیر کا سودا کرنے میں قطعی ناکام رہے اور قومی اسمبلی کی نشست پر بُری طرح شکست کھانے کے بعد نہ صرف یہ کہ وہ حیدر آباد نمبر ۶ کے صوبائی انتخاب سے دستبردار ہو گئے بلکہ اپنے بھائی قاضی عابد اور خاندان کے دیگر افراد کو بھی صوبائی حلقوں سے اخبارات میں یہ بیان دیکر دستبردار کر لیا کہ "میں اپنے مخصوص حالات کی بنا پر خود اور خاندان کے دیگر امیدواروں کو دستبردار کر رہا ہوں۔" بلکہ شاید انہوں نے یہ وصیت بھی کر دی ہے کہ آئندہ خاندان کا کوئی فرد بھول کر بھی انتخابات میں حصہ نہ لے۔ یہ مصرع عبرت کے مالک کے عین حسب حال ہے ؏

جائے عبرت سرائے فانی ہے

سکھر سے قومی نشست کے لئے جماعت اسلامی کی حمایت سے کھڑے ہونے والے آزاد امیدوار سابق مرکزی وزیر قانون اے کے بروہی کو شاید مقدمہ بازی میں کبھی ایسی ہار نہیں ہوئی ہوگی جتنی کہ انتخابی بازی میں ہوئی۔ اب غالباً وہ اپنی سیاسی شریعت سے انتخاب ہی کو خارج از بحث کر دیں گے۔ حد ہے سکھر بار ایسوی ایشن کے اکثر وکلا نے بھی اُن کے کیس کی پیروی نہیں اور نہ وہاں کے سنجیدہ اور روشن خیال اصحاب نے اُن کی فلسفیانہ تقاریر پر دھیان دیا۔ کہتے ہیں کہ بروہی صاحب کی رجائیت کو انتخاب میں شدید صدمہ پہنچا اور اب وہ قانون و فلسفہ کی ضخیم کتابوں کی ورق گردانی کر کے اپنی ہوشربا شکست کے جواز میں کوئی دلیل یا تاویل تلاش کر رہے ہیں لیکن کچھ ایسی اُلجھنوں کا شکار ہیں کہ ڈور کا سرا ہاتھ نہیں آرہا ہے۔ شاید بروہی صاحب اس حقیقت سے متفق ہوں کہ تاریخ کا دھارا آگے بڑھتا ہے پیچھے نہیں ہٹتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ دوبارہ طفلِ مکتب نہیں بن سکتے

سیّد اور عوامی لیگ

اپنے آبائی ضلع دادو کے ایک حلقہ سے قومی نشست پر پیپلز پارٹی کے ہاتھوں "سن جو سائیں" جی ایم سیّد کی زبردست ناکامی کے بارے میں پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔ سن سے آمدہ اطلاع کے مطابق جی ایم سیّد، اپنے مُشیر خاص پیر علی محمد راشدی کے مشورہ اور یوسف ہارون کی غیبی اعانت سے اور غالباً شیخ مجیب الرحمٰن کے ایماء پر ٹھٹھہ کی خالی ہونے والی قومی نشست کے لئے ضمنی انتخاب میں کھڑے ہونے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اِس ضمن میں سندھ متحدہ محاذ اپنی کینچلی اُتار کر عوامی لیگ کا چولا منڈھ رہی ہے۔ جئے سندھ نوجوان محاذ اور اُن کی حامی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے طلباء عوامی لیگ کی موافقت اور چھ نکات کی حمایت میں بیان بھی دے چکے ہیں۔ نامور شاعر شیخ ایاز نے بھی گذشتہ دنوں سکھر میں یہ اعلان کیا کہ وہ بنگلہ دیس کی مانند سندھو دیس کی خاطر عوامی لیگ میں شامل ہو رہے ہیں۔ اُدھر نواب شاہ کے قومی حلقہ سے شکست خوردہ کل پاکستان عوامی لیگ کے نائب صدر قاضی فیض محمد نے لاہور میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے مسٹر بھٹو اور ان کی پیپلز پارٹی پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے سندھ میں عوامی لیگ کی از سر نو تنظیم پر زور دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جنوری میں عوامی لیگ

"اب میں نے داڑھی رکھ لی ہے اب مجھے کینیڈی نہ کہا جائے"
— عثمان کینیڈی

گدھے پر سواری کرنے والا طالب علم اپنے ووٹروں پر سوار ہو گیا

کے سربراہ سندھ کا دورہ کر کے یہاں عوامی لیگ کو مؤثر طور پر منتظم کرنے کی کوشش کریں گے۔ بہر نوع یہاں سیاسی حلقوں اور مبصروں کی رائے میں اگر عوامی لیگ کے سہارے اور یوسف ہارون کی اعانت سے جی ایم سید نے ضمنی انتخاب میں ٹھٹھہ کے حلقہ سے دوبارہ کاغذات نامزدگی داخل کئے تو رہی سہی کسر بھی نکل جائے گی اور انکی انتخابی مہم سیاسی لحاظ سے بجھتے ہوئے چراغ کی آخری بھڑک ثابت ہو گی۔

حیدرآباد سے پیپلز پارٹی سندھ زون کے چیئرمین میر رسول بخش خان تالپور کی بھاری اکثریت سے کامیابی صحیح معنوں میں ایک عوامی خادم کی فتح ہے۔ انہوں نے بڑی طویل اور صبر آزما جدوجہد، قربانیوں اور قید و بند کی صعوبتوں کے بعد یہ مقام حاصل کیا ہے۔ ساڑھے تین سال قبل جب ذوالفقار علی بھٹو نے نئی اور عوامی سیاسی زندگی کا آغاز کیا تھا تو انہوں نے حیدرآباد میں میر رسول بخش خاں تالپور سے صلاح و مشورہ کرنے کے بعد اسی شہر میں پیپلز پارٹی کی داغ بیل ڈالنے کا تاریخی اعلان کیا تھا اور اسی تاریخی شہر میں میر صاحب کے مکان سے پیپلز پارٹی کی عوامی تنظیم شروع ہوئی تھی۔ آج میر رسول بخش خان تالپور کو اُن کی برس ہا برس کی انتھک محنتوں کا ثمرہ مل گیا ہے۔ لوگوں کو توقع ہے کہ اقتدار میں آنے کے بعد بھی میر صاحب اسی جذبہ اور خلوص کے ساتھ سیاسی مصلحتوں سے بالاتر ہو کر عوام کے وسیع تر مفاد میں کام کریں گے۔

نواب مظفر اسمبلی میں اسلامی محاذ بنائیں گے

حیدرآباد کے صوبائی حلقہ لطیف آباد کی نشست سے مہاجر، پنجابی پٹھان محاذ کے صدر نواب مظفر حسین کی کامیابی، عوام کے وسیع تر مفاد اور سندھ کے باشندوں کی یکجہتی کے لئے فالِ بد ہے۔ منفی رجحانات اور رجعت پسند نظریات کے حامل پرانے مسلم لیگی، علیگڈھ کے سابق رئیس اور حال غائب باش زمیندار نواب مظفر نے اپنی علیحدگی پسندی اور فرقہ پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ۲ جنوری ۶۹ء کو مہاجرین کا جلوس نکال کر اپنی سیاسی دوکانداری کی نمائش کی تھی۔ اخبارات میں نفاق انگیز بیانات دینے کے بعد وہ ممتاز دولتانہ کے پاس گئے لیکن دولتانہ نے کئی ہفتوں کے بعد انہیں ٹکا سا جواب دے دیا۔ کونسل مسلم لیگ سے مایوس ہونے کے بعد وہ حسن محمود، قیوم خاں اور پیر پگاڑو کے پیچھے پھرنے لگے۔ یوم شوکتِ اسلام کے جلوس میں شامل ہو کر جماعت مودودی کی ساکھ بڑھائی اور پھر اسلام کی ٹھیکہ داری اور نظریۂ تحفظ پاکستان کی اجارہ داری کا راگ الاپنے لگے۔ بہرحال مسلم لیگ قیوم گروپ نے اپنی سیاسی مصلحت کے پیشِ نظر انہیں اپنایا مگر چونکہ خالص فرقہ پرستی کی بنیاد پر اپنے اور اپنے حواریوں کے لئے شہری نشستوں کا انتخابی ٹکٹ چاہتے تھے لہٰذا دال نہ گلنے پر وہاں سے بھی مایوس ہو کر اُلٹے قدم واپس ہوئے۔

الیکشن سے چند روز قبل ووٹروں کو نفسیاتی طور پر متاثر کرنے کے لئے نواب صاحب گلے میں ہار گجرے ڈال کر گلی کوچوں میں پھرے، عوام کے جذبات کو برانگیختہ کر کے مہاجروں کے وقار کا مسئلہ بنا کر ووٹوں کے طلبگار ہوتے۔ مہاجر اُمیدواری کا واسطہ دے کر انہوں نے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کئے۔ یہاں تک کہ جماعتِ اسلامی کے اُمیدوار میاں محمد شوکت اور کونسل مسلم لیگ کے اُمیدوار انوار حسین پاکستانی اُن کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ پھر نواب صاحب نے آل پاکستان راجپوتانہ فیڈریشن کے صدر سیٹھ ولی بھائی کے ذریعہ جمعیت العلمائے پاکستان کی حمایت بھی حاصل کر لی اب ووٹر یہ سوچ رہے ہیں کہ نواب مظفر آیا مہاجر کے نام پر جیتے ہیں یا چابی کا انتخابی نشان رکھنے والی جمعیت کی سطح پر۔ بہرکیف گذشتہ دنوں انہوں نے مولانا احمد شاہ نورانی کو مدعو کیا اور اعلان کیا کہ وہ سندھ اسمبلی میں اسلامی محاذ بنائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان کا رجعت پسند محاذ عوام میں اختلاف اور تفرقہ پیدا کرنے کی ایک مذموم کوشش ہے۔ دراصل یہ محاذ سیٹھ ولی بھائی جیسے سرمایہ داروں، غائب باش زمینداروں اور نوکر شاہی کی خدمت انجام دے گا۔

عثمان کینیڈی کی منفی روش

مسلم سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے سابق طالب علم لیڈر محمد عثمان کینیڈی حیدرآباد کے ایک وارڈ سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ہیں۔ نواب مظفر کی کوشش سے انہیں جمعیت العلمائے پاکستان کا ٹکٹ مل گیا تھا جو اُن کے حق میں کارگر ثابت ہوا۔

عثمان کینیڈی اب سے تقریباً سات برس قبل گدھے پر سوار ہو کر سیاسی اسٹیج پر جلوہ گر ہوئے تھے۔ ہوا یہ کہ ۶۳ء میں جب وہ ہائی اسکول کے طالب علم تھے تو یہاں بھارت کو امریکہ کی فوجی امداد کے خلاف مظاہرہ کیا گیا، اس مظاہرے میں جلوس کے ساتھ ایک اونٹ گاڑی چل رہی تھی، اونٹ گاڑی پر ایک گدھا کھڑا تھا اور عثمان نے گدھے پر سوار ہو کر کینیڈی کا روپ دھارا تھا۔ کچھ اپنے ہیر اسٹائل اور کچھ میک اپ کی بدولت وہ واقعی نوعمر کینیڈی لگ رہے تھے۔ اُسی وقت سے انہیں کینیڈی کا خطاب مل گیا۔ پھر جب وہ سندھ یونیورسٹی میں پہنچے تو بھوک ہڑتال کی اور طالب علموں کے ایک گروہ کے لیڈر بن گئے۔ مظاہرے کے باعث گرفتار کر کے جیل میں بند کئے گئے۔ اس طرح انہوں نے وقتی شہرت حاصل کر لی۔ اور شاہی بازار و فقیر کا پڑ کے تاجروں، دوکانداروں، نیز اجمیر شریف کے سابق باشندوں اور چابی کے انتخابی نشان اور قوالوں کی تالیوں کی گونج میں ممبر اسمبلی منتخب ہو گئے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اسمبلی میں اُن کا کام نواب مظفر کی تال پر ہاں میں ہاں ملانا ہوگا اور وہ رجعت پسندوں کے آلہ کار بن کر فرقہ پرستی کو ہوا دے کر سندھ کے نئے اور پرانے باشندوں کے بھائی چارے کے خلاف فضا کو آلودہ کریں گے۔ کیونکہ اپنی کامیابی کے لئے وہ سیٹھ ولی بھائی کے بھی مرہونِ منت ہیں۔ عثمان کینیڈی نے کہا ہے کہ اب میں نے داڑھی رکھ لی ہے۔ اب مجھے کینیڈی نہ کہا جائے۔ معلوم نہ ہو سکا کہ داڑھی رکھنے کے بعد اب وہ کس کا بہروپ بھر رہے ہیں۔

گذشتہ ۳۵ سال سے باقاعدہ شائع ہونے والا منفرد ماہنامہ

ادبِ لطیف

اردو ادب کی مایۂ ناز روایات کا امین اور تجربوں کا نقیب

ادبِ لطیف

محض ایک مجلہ ہی نہیں ادب میں ایک شاندار اضافہ ہے —

ہر ماہ فکر انگیز مقالے
دلنشین اور اچھوتی کہانیاں
معیاری نظمیں اور غزلیں،
طنز و مزاح

مدیر:۔ ناصر زیدی

پتہ دفتر ۱۵۔ سرکلر روڈ۔ لاہور

کسی بھی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں۔

مکتوبِ لاہور
امین مغل

لاہور میں مزدوروں کا کنونشن

"سائنٹفک سوشلزم زندہ باد" کا نعرہ پہلی بار سنائی دیا ہے

اب محنت کشوں کو نعروں سے دھوکہ نہیں دیا جاسکتا

مزدوروں کا سیاست میں حصہ لینا ضروری ہے

سائنٹفک سوشلزم زندہ باد، کا نعرہ جب لگا تو ہم حیران ہوئے یاالٰہی! کیا ایسے ہوسکتا ہے کہ پاکستان میں سائنٹفک سوشلزم کا نعرہ فخر سے اور اعتماد سے لگایا جائے۔ لیکن یہ واقعہ تھا جو لاہور میں، ۲۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کی سہ پہر کو رونما ہوا۔

یہ صنعتی مزدوروں کا اجتماع تھا جائنٹ لیبر کونسل کے زیر اہتمام دو روزہ کنونشن میں فیصلہ کیا گیا کہ ۱۶ جنوری کو یوم احتجاج منایا جائے اور ۱۴ فروری سے ۲۰ فروری تک ہفتہ مطالبات فیصلہ کرنے والے مغربی پاکستان کے پچاس لاکھ صنعتی مزدوروں کے نمائندہ تقریباً ساڑھے پانچ سو مندوبین تھے۔

مزدوروں کا طبقاتی شعور اب آگے بڑھ چکا ہے۔ اصلاح پسندی، ہلکی پھلکی مراعات سے مطمئن ہوجانے کا زمانہ گذر گیا ہے۔ اب ٹریڈ یونین تحریک کو ملکی سیاست سے علیحدہ نہیں رکھا جاسکے گا۔ بات کھل کر سامنے آگئی کہ مزدور۔ کسان۔ راج باشعور مزدوروں کی منزل قرار پاچکا ہے۔

ہمیں وہ دن یاد آگئے جب جائنٹ لیبر کونسل قائم ہوئی تھی اور ایوبی آمریت زخمی شیر کی طرح بپھری ہوئی تھی۔ عوامی ابھار کی لہریں سیاست کے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ پھر اسی کونسل نے ۱۷ مارچ ۱۹۶۹ء کے دن ملک بھر میں ایک تاریخی ہڑتال کی۔ جس نے دائیں بازو کے جمہوریت نوازوں کی نیندیں اُچاٹ کردی تھیں۔ درمیانے اور نچلے درمیانے طبقے کے ہاتھوں سے نکل کر اب تحریک محنت کش طبقہ کے ہاتھوں میں آچکی تھی۔ لہٰذا، سازش ہوئی اور حالات ابتر بنا دیئے گئے۔ کچھ دن بعد مارشل لا لگا ہوا تھا۔

اب کہ عوام نے جمہوریت کے حق میں، عوامی خوشحالی کی حمایت میں اپنا فیصلہ سنا دیا تو ضروری تھا کہ مزدور ایک بار اکٹھے ہوتے اور اپنے لئے مستقبل کا لائحہ عمل تیار کرتے۔ ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز (صدر بشیر بختیار) ویسٹ پاکستان ورکرز فیڈریشن (صدر شمیم واسطی)، قومی مزدور محاذ رابطہ کونسل کراچی (نایاب نقوی) اور ٹیکسٹائل مزدور ورکرز فیڈریشن جائنٹ لیبر کونسل میں شامل ہیں۔ کونسل کی گورننگ باڈی نے مزدور اتحاد کو عمل میں لانے کے لئے ملک کی مزدور انجمنوں کے نمائندوں کا ایک کنونشن ۲۶، ۲۷ دسمبر کو لیبر ہال، لاہور میں بلایا۔ کنونشن کا ایجنڈا دو شقوں پر مشتمل تھا۔

۱۔ وسیع تر مزدور اتحاد کے لئے مرکزی تنظیم کا قیام

۲۔ مزدور مسائل کے حل کے لئے لائحہ عمل کی تشکیل۔

مرزا محمد ابراہیم کی پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن پاکستان مزدور فیڈریشن، قومی مزدور محاذ اور وفاقی انجمن صحافیان کو بطور مہمان مدعو کیا گیا تھا۔

افتتاحی اجلاس ہفتہ کے دن دس بجے شروع ہوا۔ اس کی صدارت پریذیڈیم نے کی جس میں جناب بشیر بختیار، کراچی مزدور رابطہ کونسل کے نایاب نقوی ٹیکسٹائل مزدور ورکرز فیڈریشن کے سعید ہاشمی لودھی، ٹیکسٹائل ٹریڈ یونین فیڈریشن کے محمد شفیق اور ویسٹ پاکستان ورکرز فیڈریشن کے ریاض حیدر زیدی تھے۔

استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین خورشید احمد نے شرکاء کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ انتخابات کے بعد مغربی پاکستان کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے محنت کش طبقہ اور غریب عوام کے خلاف نئی سازش تیار کی ہے۔ وہ صنعتی اداروں میں پیداوار کم کرکے بے روزگاری میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور چور بازاری سے ضروریات زندگی مہنگی کرکے عوامی امنگوں کو مایوسی میں بدلنے کی کوشش کررہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ محنت کش طبقہ کو متحد ہوکر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے گٹھ جوڑ کا مقابلہ کرنا چاہئے۔

مغربی پاکستان ورکرز فیڈریشن کے سیکرٹری نبی احمد صاحب معروف رہنما ہیں۔ نور خان کی لیبر مشاورتی کونسل میں وہ بھی شامل ہوتے تھے۔ لیکن کراچی مزدور کنونشن کے فیصلہ کی اتباع کرتے ہوئے وہ اس سے مستعفی ہوگئے تھے۔ نبی احمد صاحب نے کہا کہ صرف انقلاب کا نام لینے سے انقلاب کی تکمیل نہیں ہوجاتی۔ اس کے لئے مشترکہ جدوجہد کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ سرمایہ دار جاگیردار اور سامراج کے ایجنٹ عوامی راج کے قیام میں روڑے اٹکا رہے ہیں، لیکن مزدور متحد ہوکر اپنے دشمنوں کو شکست دے سکتے ہیں عوامی جدوجہد کو صحیح طریق پر آگے بڑھانے کے لئے طبقاتی تنظیموں کا استحکام ضروری ہے۔

مغربی پاکستان ورکرز فیڈریشن کے مندوب جناب محمد یامین کراچی کی سکیورٹی پیپر مل یونین کے صدر ہیں۔ اور پچھلے سال کی سب سے بڑی کامیاب ہڑتال کے رہنما ہیں۔ حال ہی میں قید و بند سے رہا ہوکر آئے ہیں۔ انہوں نے کہا مزدور طبقہ کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنی لڑائی کو عوام کی معاشی اور اقتصادی لڑائی سے ہم آہنگ کرے۔ اگر مزدوروں نے ایسا نہ کیا تو استحصال کا شکار ہونے والے عوام ان کو معاف نہیں کریں گے۔

مرزا ابراہیم کی تقریر

ویسٹ پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے صدر ممتاز مزدور رہنما مرزا محمد ابراہیم نے کہا کہ محنت کش طبقے کے مسائل صرف اسی صورت میں حل ہوسکتے ہیں۔ جب مزدور، کسان راج ملک میں قائم ہو۔ انہوں نے کہا ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ سامراج دشمن کون ہے اور سامراج دوست کون ہے۔ قومی ملکیت میں صنعتوں کے لئے جانے کے بارے میں مرزا صاحب نے کہا کہ قومی ملکیت کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہئے کہ انتظامات نوکر شاہی کے سپرد ہوجائیں۔ بلکہ قومی ملکیت میں لی جانے والی صنعتوں، بنکوں اور انشورنس کمپنیوں کا انتظام عوام کے نمائندوں کے سپرد ہونا چاہیئے۔ مرزا محمد ابراہیم نے کہا کہ انقلابی جدوجہد میں مزدور کے اصل ساتھی کسان، نچلے متوسط طبقے کے لوگ اور انقلابی دانشور ہیں۔ اس وقت بعض ایسی سیاسی



جماعتیں ہیں جو نام تو مزدوروں کا لیتی ہیں مگر ان کی قیادت شہزادوں اور نوابزادوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ جماعتیں عوامی انقلاب نہیں لا سکتیں۔ یہ نام نہاد ترقی پسند جماعتیں سائنسی سوشلزم کے شعور کو کُند کر رہی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سوشلزم ایک ہے جو مارکس، اینگلز، لینن اور ماؤزے تنگ کا ہے۔

مغربی پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونین کے مندوب اختر حسین کیانی اور ٹیکسٹائل مزدور ورکرز فیڈریشن کراچی کے مندوب سعید پاشا لودھی نے کہا کہ انتخابات میں مزدوروں نے اپنے شعور کا ثبوت دیا ہے۔ اگر منتخب ہونے والوں نے بھی سابقہ حکمرانوں کی طرح اپنے وعدے پورے نہ کئے تو ان کے خلاف بھی اسی طرح تحریک چلائی جا سکتی ہے۔ جیسی تحریک ایوب آمریت کے خلاف چلائی گئی تھی۔ ملک کے جاگیردار اور سرمایہ دار پھر یہ سازش کر رہے ہیں کہ مارشل لا بدستور نافذ رہے۔ انہوں نے کہا کہ مزدور کسی کے زرخرید غلام نہیں۔ انہوں نے مغربی پاکستان میں ایک پارٹی کا ساتھ دیا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب وہ تنقید کے حق سے دستبردار ہو گئے ہیں۔

ٹیکسٹائل ٹریڈ یونین فیڈریشن کے مندوب جناب محمد شفیق مغربی پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونین کے مندوب نثار الحق عزیز اور ملک فضل الٰہی قربان نے کہا کہ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں، کراچی مزدور رابطہ کونسل کے نایاب نقوی نے کہا کہ کامیاب ہونے والی جماعتوں نے ابھی تک حکومت نہیں بنائی۔ اور جب تک وہ حکومت نہیں بناتے، ان کے خلاف بے جا الزام تراشی نہیں کرنی چاہیئے۔

مغربی پاکستان ورکرز فیڈریشن کے راہنما نموس گل کراچی اور باقی سندھ کے مزدور حلقوں کی معروف شخصیت ہیں، پچھلے دنوں جیل سے رہا ہو کر آئے ہیں اس انقلابی کارکن نے کہا کہ مزدوروں کا اپنے معاشی اور اقتصادی مسائل حل کرانے کے لئے ملکی سیاست میں حصّہ لینا ضروری ہے۔ جذباتی نعرے لگا کر اقتدار کی کرسی تک پہنچنے والوں کے لئے آنے والا وقت بہت کڑا ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ اسمبلی میں عوامی نمائندوں کے مرتب کردہ آئین کو مسترد کرنے کا اختیار کسی کو نہیں ہونا چاہیئے۔ اور اس معاملہ میں اسمبلی خود مختار ہونی چاہیئے۔ کیونکہ قومی اسمبلی کے نمائندے بارہ کروڑ عوام کے نمائندے ہیں۔

دُوسرا دِن:- ۲۷ر دسمبر ۱۹۷۰ء

صبح کے اجلاس سے خطاب کرنے والوں میں علاؤالدین بٹ صدر نیشنل فین یونین گجرات لیبر فیڈریشن کے راحت ملک، پیکجز ورکرز یونین کے صدر الطاف حسین بلوچ، کراچی کے میاں بشیر احمد کراچی کوہ نور کیمیکل ورکرز یونین کے سیکرٹری سید اظہار، شمسی کلاتھ ورکرز یونین کراچی کے سیکرٹری محمد معروف، کوہ نور ریان ملز کے منصف رضا، پیکجز کے میر افضل، حبی سنز کی یونین کے محمد عثمان گولڈن ایمپلائز یونین کراچی کے نمائندے، تربیلا ایمپلائز یونین کے محمد اشرف ملک، پنڈی کے سنیپر ایمپلائز یونین کے محمد یونس اسماعیل آباد کی کالونی ٹیکسٹائل ملز یونین کے محمد شریف، لاہور کے بدر السلام ابدالی، لاہور کے طاؤس خاں اور کراچی کی کنیز فاطمہ قابلِ ذکر ہیں۔

راحت ملک گجرات سے اسمبلی کے انتخاب میں ناکام رہے تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز چند اشعار سے کیا ہمارا خیال ہے کہ یہ اشعار حاضرین کے مجموعی موڈ سے کافی حد تک ہم آہنگ تھے گو ان کے مافیہ سے اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

اب ہمیں شعلۂ گفتار نہ دے
جل ہمیں قافلہ سالار نہ دے
سَرِ غریبوں کا قلم کر دے گی
دستِ زردار میں تلوار نہ دے
اپنی دولت سے غریبوں کو نواز
اب انہیں دعوت ایثار نہ دے
قول کو فعل کے شیشے میں اُتار
اب اذاں صورتِ زردار نہ دے

راحت ملک کے یہ اشعار بہت پسند کئے گئے۔ گجرات کے مقامی مسائل کا ذکر کرنے کے بعد اُنہوں نے بتایا کہ گجرات میں جب عوامی تحریک کا آغاز ہوا تو مزدوروں نے ایک موقعہ پر اُس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ میاں خاں شہید ہو گئے، ۲۴ مزدور گرفتار ہوئے، ۵ زخمی ہوئے۔ میں بھی گرفتار ہوا۔ گولی چلی، گولی چلانے والے کون تھے؟ راحت ملک نے بتایا کہ کنونشن لیگی لیڈر اور سابق ڈپٹی سپیکر چوہدری فضل الٰہی نے ڈپٹی کمشنر سے کہہ کے گولی چلوائی۔ اور جب الیکشن آئے تو اُنہوں نے جماعت اسلامی کا ٹکٹ حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن جب ٹکٹ نہ مِلا تو پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ راحت ملک نے کہا کہ ہم بھٹو صاحب کہتے ہیں: "ہم نے آپ کا ساتھ دیا ہے۔ آئندہ بھی ساتھ دیں گے۔ مگر یاد رکھئے، اگر آپ نے آمریت نافذ کرنا چاہی تو مزدور آپ کو فِکس اپ کر دیں گے۔"

الطاف بلوچ نے بتایا کہ پیکجز لمیٹڈ کے مالک تیئیس خاندانوں میں سے ایک خاندان کے فرد جناب واجد علی شاہ کو یہ خوش فہمی تھی کہ جماعت اسلامی کامیاب ہو گی۔ ہم مزدوران کو مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کی جماعت کو ایک نشست ملی ہے۔ پیکجز کی تاریخ بیان کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ۰۰۴ مزدور اس کارخانے سے برطرف کئے جا چکے ہیں۔

شمسی کلاتھ ورکرز یونین کے محمد معروف صاحب نے پیشہ ور ٹریڈ یونین لیڈروں پر کڑی نکتہ چینی کی جو وقت پر غائب ہو جاتے ہیں۔

منصف رضا کوہ نور ریان ملز میں ہڑتال کے مرحلے سے ابھی ابھی فارغ ہوئے ہیں۔ اِس ذہین پڑھے لکھے کارکن نے بتایا کہ حالات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عوام بہت آگے ہیں مگر اُن کے لیڈر بہت پیچھے ہیں۔ انہوں نے بزرگ ٹریڈ یونین رہنماؤں پر سخت تنقید کی اور کہا کہ جب ہمارے ساتھیوں کو کوڑے لگائے جا رہے تھے، انہیں جیلوں میں پھینکا جا رہا تھا، یا نوکری سے برطرف کیا جا رہا تھا اُس وقت ہم ان بڑے لوگوں کے پاس مدد کے لئے جاتے تھے۔ لیکن وہ ہماری مدد تو کیا کرتے ایک دن کی ہڑتال تک نہ کرا سکے۔ یہ کہتے تھے کہ ابھی موقعہ نہیں۔ مزدور کا شعور ابھی بیدار نہیں ہوا۔ لیکن حالات نے اُن کی سوچ کو غلط ثابت کر دیا

امیر افضل پیکجز ورکرز یونین کے سرگرم اور پُرانے ٹریڈ یونین کارکن ہیں۔ ان کو کوڑوں کی سزا دی گئی تھی۔ اُن کا تعارف یہ کہہ کر کرایا گیا کہ ابھی ابھی جیل سے آئے ہیں۔ امیر افضل نے اسٹیج پر آ کر یہ کہا کہ پاکستان مزدوروں کسانوں کا ملک ہے۔ ہم ان پارٹیوں کو نہیں مانیں گے جو اسمبلیوں میں جا کر وعدے پُورے نہیں کریں گے۔ اُنہوں نے کہا کہ پولیس سپاہی اور پٹواری کی تنخواہوں میں اضافہ ہونا چاہیئے تاکہ وہ پیکجز کے واجد علی شاہ اور دُوسرے سرمایہ داروں کے ملازم نہ بنیں۔

تربیلا ایمپلائز یونین کے راہنما کو شکایت تھی کہ دائیں بازو کے اخبارات مزدور دُشمن پالیسی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے تربیلا ہڑتال کے بلیک آؤٹ کا ذکر کیا۔

ولی محمد کراچی کے جوشیلے مقرر تھے۔ تقریر کرتے ہوئے انہوں نے جوشِ خطابت میں کہا کہ "مزدور سرمایہ دار کو لات ماریں گے" اور جوشِ خطاب میں ہی انہوں نے باقاعدہ لات مارنے کا مظاہرہ بھی کر ڈالا۔

طاؤس خاں پُرانے ٹریڈ یونین رہنما ہیں۔ اُن کی تقریر پُر مغز اور دلچسپ تھی۔ انہوں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ کوئی مزدور انتخاب میں کامیاب نہیں ہوا۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ ووٹ مزدُور کے نعرے پر ہی لیا گیا تھا۔ اِس لحاظ سے موجُودہ انتخاب کو مزدوروں کی سوچ کی کامیابی کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بغیر سیاسی شعور کے مزدور طبقہ نجات نہیں حاصل کر سکتا۔ انہوں نے کہا اے مزدور ساتھیو، سرمایہ دار اور جاگیردار کو اب اپنے نعرے سے

پاکستان میں بھی سوشلزم کو ملاوٹ کے ساتھ
پیش کیا گیا ہے، اور اس طرح مزدور طبقہ کو دھوک
دیا گیا ہے۔ لیکن مزدور طبقے کو بیوقوف بنانے کی

ہلنے نہ دو ۔ مزدور رہنماؤں کو بھی اپنی گرفت میں لے لو تاکہ وہ بھی نہ ہلنے پائیں۔ انہوں نے ورکرز فیڈریشن کے سیکرٹری نبی احمد کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں فخر ہے کہ ہماری صفوں میں کم از کم ایک شخص ایسا ہے جس نے مشاورتی کونسل کی ممبری پر لات ماری اور پندرہ سو روپیہ ماہوار کا نقصان برداشت کر لیا! طاؤس خاں نے مزدوروں سے کہا کہ وہ نوکرشاہی کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھیں ۔

طاؤس خاں نے مجیب الرحمٰن اور بھٹو کے باہمی اختلاف کو تلمیح کے ذریعہ بیان کیا۔ انہوں نے کہا ۔ بھائیو! گڈ (گاڑی) پھنس گئی ہے۔ دونوں ڈھگے (بیل) پھنس گئے ہیں۔ دونوں کو چابک مارو۔ ان سے کہو کہ ہم اپنے کاندھے دے کر تمہاری گڈ کو باہر نہیں نکالیں گے ۔ خود کوشش کر و کیچڑ اور دلدل سے نکلنے کی ۔" انہوں نے مزدوروں کو مشورہ دیا کہ آہستہ آہستہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے گرد گھیرا تنگ کرتے جاؤ ۔ تاکہ تین مہینے بعد جب انتقالِ اقتدار ہو جائے تو ان کے لئے عوام کو دھوکا دینے کا موقعہ باقی نہ رہے ۔

> کوششیں جسطرح پہلے ناکام ہوگئی ہیں اسی طرح
> یہ کوشش آئندہ بھی دیر تک کامیاب نہیں رہیں گی،
> مزدور طبقہ ملاوٹی سوشلزم کو سوشلزم تسلیم نہیں کرتا

محترمہ کنیز فاطمہ مزدور تحریک کی عظیم مجاہدہ ہیں ۔ وہ جلسہ کے اختتام کے قریب ہال میں تشریف لائیں تو مزدوروں نے ان کا تالیوں سے استقبال کیا۔ انہوں نے کہا کہ اب گلی گلی کوچے کوچے پھیل جاؤ، اور سوشلزم کے نعرے کو عام کر دو —

آخری اجلاس چار بجے شروع ہوا۔ بین الاقوامی انقلابی تحریک کے کہن سال فرزند دادا امیر حیدر نے اس سے خطاب کیا۔ برطانوی سامراج کے خلاف اور مزدوروں کے حقوق کے لئے دادا امیر حیدر کی داستان جہاد کے ورق امریکہ، یورپ اور ایشیا میں بکھرے پڑے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کس طرح دو سال کی عمر میں پنجاب کے ایک گمنام گاؤں سے باہر نکلے ۔ فٹ پاتھ سے انہوں نے زندگی شروع کی ۔ اور انقلابی تحریک کے لئے کام کیا۔ ۱۹۰۰ء سے جب اُن کے داڑھی مونچھ نہ تھی، اب تک انہوں نے بڑی بڑی بادشاہتوں کا تختہ الٹتے دیکھا اور روس اور چین کے عظیم سوشلسٹ انقلاب دیکھے ۔ انہوں نے کہا اب ساری دُنیا تین دھڑوں میں بٹ چکی ہے۔ سامراجی دھڑا، سوشلسٹ دھڑا اور تیسری دنیا ۔ اب دنیا کے لئے سوشلسٹ معیشت کو اختیار کئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہا ۔ میں ایک معاشی بحران کو ابھرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں ۔ ایسے میں اپنی تنظیم کو ایک مرکز پر لاؤ ۔

تھوڑی دیر بعد حبیب جالب پنڈال میں داخل ہوئے مزدوروں نے ان کا والہانہ استقبال کیا، معلوم ہوا کہ مزدوروں کے دلوں میں اُن کے لئے محبت اور پیار وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جا رہا ہے ۔ شاعرِ انقلاب حبیب جالب زندہ باد کے نعروں کے درمیان انہوں نے تقریر کی اور ساتھ ساتھ اپنا کلام بھی سُنایا ۔ انہوں نے کہا کہ مزدور اور محنت کش عوام نے اپنے حق کو توپوں، بندوقوں اور گولیوں کی حکومت کے خلاف استعمال کیا۔ اور آئندہ بھی ظلم کے خلاف جہاد کرتے رہیں گے ۔ انہوں نے مزدوروں سے کہا ۔ آپ ہی کو حکومت کرنے کا حق حاصل ہے ۔ ہمیں کسی دھوکے میں نہیں آنا چاہئے ۔ شاعر نے کہا میں نے ریلوے کوارٹرز دیکھے ہیں، جن کے ایک ایک کمرے میں دس دس افراد رہتے ہیں ۔ اسکے برعکس میلوں بڑے بنگلے میں ایک بوڑھی بیگم، ایک بیرا اور ایک کُتّا رہتے ہیں ۔ یہ کیسی دھاندلی ہے ! ہم اس دھاندلی کو ختم کریں گے ۔

خالص اور ملاوٹی سوشلزم

حبیب جالب سے سامعین نے بار بار فرمائش کر کے شعر سُنے : کندن لعل کو پانچ کوڑوں کی جو سزا دی گئی اس پر حبیب جالب کی نظم اب مقبولِ عام ہو گئی ہے ۔ مزدوروں کو وہ نظم خاص طور پر پسند آئی ۔

اسکے بعد ویسٹ پاکستان ورکرز فیڈریشن کے صدر شمیم واسطی نے سبجیکٹس کمیٹی کی طرف سے مجوزہ قراردادیں پڑھ کر سنائیں ان کی حمایت میں تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا ۔ شمیم واسطی شعلہ بیان مقرر ہیں ۔ انہوں نے کہا کہ جب مارشل لا لگا تو خوف کے مارے دودھ بیچنے والوں نے دودھ میں ملاوٹ بند کر دی ۔ اب جو خالص دودھ پینے کو ملا تو وہ طبیعتیں جو نا خالص دودھ سے آشنا تھیں ۔ خالص دودھ پی پی کر بیمار ہونا شروع ہو گئیں ۔ کچھ ایسا ہی حال نظریات کی دنیا میں ہوتا ہے ۔ ملاوٹوں بھرے نظریات سے مانوس ہونے والوں کے سامنے جب نظریئے پیش کئے جائیں تو لوگوں پر غشی طاری ہونے لگتی ہے ۔ یہی حال سوشلزم کے نظریہ کے ساتھ ہوا لوگوں نے ملاوٹ کر کے اس نظریئے کو مختلف ممالک کے مزدور طبقہ کے گلے سے اتارنے کی کوشش کی ۔ جرمنی میں سوشلزم میں ملاوٹ کی گئی اور اسے قومی سوشلزم کی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے ۔ لیکن وہاں خوش قسمتی سے مزدور طبقے نے اپنے طبقاتی شعور کی بدولت اسے جلد ہی پہچان لیا ۔ پاکستان میں بھی سوشلزم ملاوٹ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ۔ اور اس طرح مزدور طبقے کو دھوکا دیا گیا ہے ۔ لیکن جس طرح پہلے مزدور طبقے کو بے وقوف بنانے کی کوششیں ناکام ہو گئی ہیں ۔ اسی طرح یہ کوششیں آئندہ بھی دیر تک کامیاب نہیں رہیں گی ۔ مزدور طبقہ ملاوٹی سوشلزم کو سوشلزم تسلیم نہیں کرتا ۔

انہوں نے کہا جب خالص سوشلزم کی اور کمیونسٹ پارٹی سے پابندی ہٹانے کی بات کی جائے تو لوگوں کو غشی طاری ہو جاتی ہے ۔ حالانکہ مزدوروں کو اپنی پارٹی بنانے کا اتنا ہی حق ہے جتنا سرمایہ داروں کو اپنی پارٹیاں بنانے کا ہے ۔ شمیم واسطی نے مطالبہ کیا کہ کمیونسٹ پارٹی سے پابندی ہٹالی جائے ۔ مزدوروں نے اس مطالبے کا پُرجوش تالیوں سے خیر مقدم کیا ۔

اس کے بعد ورکرز فیڈریشن کے آرگنائزنگ سیکرٹری ڈاکٹر اعزاز نذیر آئے ۔ لمبے تڑنگے جوان محنت کش طبقے کے وقار عظمت اور عزم کا نشان انہوں نے اپنی تقریر سے پورے ہال کو مسخر کر لیا ۔ خاموشی ایسی کہ سانس رک رک جائے ۔

ڈاکٹر اعزاز نذیر کی تقریر

سندھ کے شاعر شیخ ایاز کے ایک شعر سے انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز کیا ۔

ہمارے خون میں ڈوبا ہوا سُرخ جھنڈا آسمان کی بلندیوں تک لہرائے گا ۔

وہ دِن آئے گا وہ دِن آئے گا ۔

انہوں نے کہا : "نئی صبح کے پیغامبرو! جب ہم ٹریڈ یونینوں میں جمع ہوتے ہیں تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے ۔ ہم لوگوں نے ہندوستان کی زمین کے چپے چپے پر اپنا خُون بہایا اس لئے کہ ایک ایسے ملک کی تعمیر ہو جس میں محنت کا راج ہو، ایسا ملک پیدا ہو سکے جس میں سرمایہ دار ہماری شہ رگ کا خُون نہ پی سکے ۔ لیکن افسوس کہ آزادی ملنے کے ساتھ ہی سامراجیوں نے ہمارے رجعت پسند طبقات کے ساتھ ہاتھ ملائے ۔ تیئیس سال تک آمریت، سرمایہ داری، جاگیرداری اور سامراج کی مکروہ سازشیں ہم سے قربانی پر قربانی لیتی رہیں ۔ جب ہم پچھلی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں لوٹنے کے ایک عظیم منصوبے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ۔ آج کچھ لوگ کہتے ہیں، ماضی کی ریت کھنگالنے سے کیا فائدہ! ہمیں مستقبل کی فکر کرنی چاہئے ۔ لیکن اے ساتھیو! اگر ماضی کے اندر رکھی ہوئی بنیادیں کمزور اور ٹیڑھی ہوں گی تو مستقبل میں تعمیر ہونے والی عمارت بھی کمزور اور ٹیڑھی ہو گی ۔ اس لئے ماضی کو جاننا بڑا ضروری ہے ۔

ڈاکٹر اعزاز نذیر نے کہا مجھے نہیں معلوم کہ اس پنڈال میں بیٹھے ہوئے کتنے لوگ صحیح معنوں میں مزدوروں اور کسانوں کا راج چاہتے ہیں ۔ تاہم میں تم سے مخاطب ہوں، تم، جن کو تاریخ نے ایک مقدس فریضہ سونپا ہے ۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ہمارے ملک میں تاریخ دُہرائی جا رہی

ہے، جب فرانس میں عوامی نفرت کا دھارا تیز ہوا تو سرمایہ داروں کے پروردہ دانشوروں نے آزادی اخوت اور مساوات کے نعرے بلند کئے۔ اِن نعروں کی بدولت فرانس کا مزدور سرمایہ داروں کا دُم چھلا بن کے رہ گیا اور فرانس میں سرمایہ داروں کی ڈکٹیٹر شپ اُبھری یہی صورت حال ہمارے ملک میں رونما ہو رہی ہے۔ ہم محنت کرنیوالوں نے حالیہ اِنتخابات میں اِس امر کا اظہار کیا کہ ہم اس ملک کے سیاسی اور معاشی نظام میں تبدیلی چاہتے ہیں۔ لیکن یہ میرے اور تمہارے شعور کا دیوالیہ پن ہے کہ ہم اس بات کا تعین نہ کر سکے کہ کِن عوامل سے اِنقلاب کی تکمیل ہوگی۔ اِنتخابات میں محنت کشوں کے کاندھوں پر چڑھ کر وُہی لوگ اوپر آگئے جو محنت کشوں کے دُشمن ہیں۔ مجھے یہ کہنے دیجئے کہ جس تبدیلی کی آپ نے خواہش کی ہے، وہ اِسی صورت میں ممکن ہے جب سامراج کی لُوٹ کھسوٹ کا خاتمہ ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ سامراج کے لگے ہوئے سرمایہ کو ضبط کر لیا جائے۔ مُلک کو خود مکتفی بنانے کے لئے ضروری ہے کہ جاگیرداری نظام ختم کیا جائے، بنکوں اور انشورنس کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لے لیا جائے اور پبلک سیکٹر کو مضبوط کیا جائے۔

نذیر صاحب نے کہا ہم روزانہ سُنتے ہیں گرانی ختم کرو گرانی ختم کرو۔ معاف کیجیے، یہ مطالبہ بالکل بچکانہ ہے۔ مُلک سے گرانی کا خاتمہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ جاگیرداری کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ آبادی کا تناسب بڑھ گیا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ آبادی بڑھ گئی ہے لیکن زیرِ کاشت زمین بھی تو بڑھ گئی ہے۔ صوبہ سندھ میں پچاس لاکھ ایکڑ بیراجی زمین ایسے لوگوں میں بانٹ دی گئی ہے جو خود کاشت نہیں کرتے۔ سابق سرکاری افسر یا فوجی افسر ہیں۔ اس وقت لاکھوں ایکڑ زمین بیکار پڑی ہے۔ کیونکہ زمینداروں کو اسے کاشت کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ جب تک ۸۰٪ ہِماں آبادی کی خاطر جاگیرداری، زمینداری کا خاتمہ نہیں کیا جاتا، معاملات سُدھر نہیں سکیں گے۔

ڈاکٹر اعزاز نذیر نے محنت کش عوام کے افلاس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ جیل میں ہر قیدی کو ۷۰ پیسے فی یوم دیئے جاتے تھے، جو ایک ہنرمند کاریگر کی یومیہ آمدنی سے زیادہ ہے کہ اس پر مستزاد یہ کہ جیل میں رہائش مُفت ہے۔ بجلی، پانی مُفت اور طبّی امداد مُفت۔ تو بھائیو! بتاؤ جیل اچھا یا آزادی؟

مرزا محمد ابراہیم اور ان کی طرح کے پُرانے مزدور رہنماؤں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے۔ ڈاکٹر اعزاز نذیر نے کہا کہ آپ اُن کے موقف سے بعض اوقات اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان کے خلوص اور قربانی سے انکار نہیں کر سکتے انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں سہیں، سیفٹی ایکٹ، ڈیفنس آف پاکستان وغیرہ کے پابند ہوئے، لیکن مزدور تحریک کا ساتھ نہیں چھوڑا، آج بھی سینکڑوں مزدور، کسان اور سیاسی کارکن جیلوں میں بند پڑے ہیں، پچاس کے قریب سیاسی کارکن جیلوں میں اپنی بینائی کھو بیٹھے ہیں۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ موفی سنگھ، سکیدار، دسنیدار اور دُوسرے سیاسی کارکنوں کو فی الفور رہا کیا جائے اور امام علی نازش امروہی اور عزیز سلام بخاری کے خلاف ۱۹۵۸ء سے جاری شدہ وارنٹ گرفتاری واپس لئے جائیں۔

مزدور نمائندوں کے اِس اجتماع کی قراردادوں کا متن آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے۔

میری طرح بے شمار لوگ نئی صبح کے انتظار میں ہیں

بقیہ صفحہ ۲۳ سے آگے

بعد پولنگ اسٹیشن پر اپنا ووٹ ڈالنے کے لئے پہنچے تھے۔
مولابخش کی عمر تقریباً پینسٹھ سال ہے، مگر وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ ضعیف اور لاغر دکھائی دے رہا تھا، اس کی سفید داڑھی اور مونچھوں کے بال میل سے گدلا گئے تھے۔ پیشانی پر بے شمار شکنیں اُبھر آئی تھیں، جھریوں کے پھیلے ہوئے پیچ در پیچ جال میں ماضی کے دُکھ بھرے دنوں کی بے پناہ تلخیاں کروٹیں لے رہی تھیں وہ پولنگ اسٹیشن سے کچھ دور بیٹھا ہوا اپنے تھکے ہوئے پاؤں کو ہولے ہولے سہلا رہا، اس کا چچا زاد بھائی اللہ بخش پرچی بنوانے چلا گیا تھا

مولابخش نے بتایا کہ پہلے وہ ملیر کے قریب ایک گوٹھ میں رہتا تھا، اس کے رشتہ دار بھی اس جگہ رہتے تھے، کسی بات پر اُن میں تکرار ہوگئی اور یہ تکرار بڑھتے بڑھتے لڑائی جھگڑے میں تبدیل ہوگئی، مولابخش لڑائی جھگڑا پسند نہیں کرتا تھا مجبوراً اس نے وہ جگہ چھوڑ دی اور سہراب گوٹھ چلا آیا۔ کچھ دنوں ہوٹل کا بھی کاروبار کیا مگر چند ہی روز میں کاروبار ٹھپ ہوگیا اور دوبارہ اسے محنت مزدوری کا پرانا کام شروع کرنا پڑا۔ وہ ہر صبح نیو چالی جایا کرتا تھا، جہاں ٹرکوں اور اونٹ گاڑیوں سے چاول گندم اور شکر کی بوریاں اتار کر گودام میں پہنچایا کرتا تھا، جوانی کا جسم تھا اس لئے مسلسل دس گھنٹوں کی جان توڑ محنت کی پروا نہیں کرتا تھا، پھر بھی جب شام کے وقت وہ اپنے کام سے فارغ ہوتا تو کمر سیدھی کرنے میں اسے کئی گھنٹے لگ جاتے تھے۔

ایک دن گودام میں بوری رکھتے ہوئے اچانک مولابخش کا پاؤں پھسل گیا اور وہ تلے اوپر رکھی ہوئی بوریوں سمیت دھڑام سے نیچے آگرا۔ اس کی کمر پر سخت چوٹ آئی تھی، اس کے ساتھیوں نے اُسے اسپتال میں داخل کرا دیا، جہاں وہ ایک ماہ تک زیرِ علاج رہا، ایک ماہ کے بعد جب وہ اسپتال سے رخصت ہوا تو اس لائق نہ تھا کہ وہ دوبارہ محنت کا کوئی کام کر سکتا۔ کئی دِنوں تک وہ اپنے گوٹھ کی جھگی میں پڑا پڑا سوچتا رہا کہ اب وہ زندگی کی گاڑی کس طرح سے کھینچے گا مجبور ہو کر اس نے اپنے چچا زاد بھائی اللہ بخش کو خط لکھوایا جو دادو میں ایک زمیندار کا ملازم تھا، اللہ بخش اپنے بھائی کے حالات سن کر تڑپ اٹھا اور وہ وہاں سے فوراً کراچی چلا آیا۔

مولابخش کی زبانی معلوم ہوا کہ اب اللہ بخش ان کی زندگی کا واحد سہارا ہے، تمام دن نیو چالی پر اناج کی بوریاں ڈھونے کے بعد اسے جو کچھ ملتا ہے وہ اس کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیتا ہے۔ مولابخش نے سامنے سے اپنے بھائی کو آتے دیکھ کر کہا۔ "سائیں اس دنیا میں اس جیسا آدمی بہت کم ہے۔ اگر سبھی لوگ اللہ بخش بن جائیں، ایک دوسرے کا سہارا بن جائیں تو کوئی آدمی بے سہارا نہ ہوگا اور نہ ہی کوئی بھوک سے مرے گا۔"

مولابخش نے بتایا کہ وہ اس کے بھائی تلوار والے کو ووٹ دیں گے۔ میں نے جب یہ سوال کیا کہ کیوں؟ تو اس کی چھوٹی چھوٹی پانی سے بھری ہوئی آنکھوں میں روشنی کی ایک ہلکی سی چمک لہرا کر رہ گئی۔ اس نے اپنی داڑھی کو کھجلاتے ہوئے کہا۔ "سائیں اتنی عمر ہوگئی، کسی نے پلٹ کر خبر نہ لی کہ مولابخش تیری کیا ضرورت ہے، بھوکا ہے، پہننے کے لئے کپڑے ہیں، رہنے کے لئے مکان ہے، کسی نے بھی تو آج تک نہیں پوچھا۔ اللہ بخش کہتا ہے کہ یہ تلوار والے ہماری ہی باتیں کرتے ہیں۔ ہم لوگوں پر جو کچھ گزرتی ہے، وہ دوسروں کو سناتے ہیں، وہ ہماری مصیبتوں کے دن ختم کر دیں گے، اسی لئے میں اور میرا بھائی تلوار والے کو ووٹ دیں گے۔"

اللہ بخش تلوار والے کیمپ سے پرچی بنوا کر مولابخش کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنے بڑے بھائی کو سہارا دے کر اُٹھایا، پتلی سی چھڑی اُٹھا کر اُسنے اپنے بھائی کو تھما دی اور اس کا ایک ہاتھ پکڑ کر دھیرے دھیرے اس جانب چلا جہاں پہلے سے بے شمار لوگ ایک لمبی سی قطار میں کھڑے اپنی باری کے منتظر تھے۔

مولابخش نے اپنی طرح بے شمار لوگوں کو ایک لمبی سی قطار میں کھڑے ہوئے دیکھ کر کہا۔
"مونجھی طرح انھن سبھی لوگ اِک نئی زندگی جی انتظار مھ آنھی"

کلیم الحسن نقوی پرنٹر اینڈ ہاشمی پبلشر انجمن پریس میں چھپا۔ دفتر لیل و نہار عظمت منزل، ۱۶۶ سنٹرل کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی نمبر ۲۹ سے شائع ہوا۔ ایڈیٹر مسلم ضیائی

قیمت
اور
کارکردگی
کا بہترین امتزاج

روسی ٹیلیویژن سیٹ کی چند خصوصیات۔

- صاف اور واضح تصویر
- دو طاقتور اسپیکر ہائی فائی ساؤنڈ
- نہ ٹوٹنے والا اسکرین
- مینز ٹرانسفارمر آٹومیٹک کنٹرول
- ٹیپ ریکارڈنگ اور ریموٹ کنٹرول کا انتظام
- ۱۹" سیٹ



فروخت کے بعد خدمات میں مندرجہ ذیل امور شامل ہیں۔

- چھ مہینے کی گارنٹی مفت فنی مشورہ
- گارنٹی کی مدت میں فاضل پرزوں کی مفت فراہمی
- ایک سال تک پکچر ٹیوب کی مفت فراہمی
- گارنٹی کی مدت میں گھر پر مفت سروس
- ۲۳" سیٹ
- ہمارے ورکشاپ میں مرمت ہونے والے سیٹوں پر مزید تین ماہ کی سہولت

گھر گھر ٹیلیویژن پہنچانے کا عزم

سول ڈسٹری بیوٹرز

عظیم سنز

مہتہ لاج وکٹوریہ روڈ کراچی ۳ - فون : ۷۲۶۶۵ - ۷۳۰۵۱

پاکستان میں سول ایجنٹ : نصرت ایجنسیز لمیٹڈ

کراچی فون۔ ۱۷۶۰۱ ۳۱ ، لاھور فون۔ ۶۲۶۰۶ ، راولپنڈی فون۔ ۶۷۹۳۵ ، پشاور فون۔ ۳۹۰۱

THE LAILO-NAHAAR WEEKLY. KARACHI. R. L. No. S. 2744
10·1·1971

سردرد؟

'اسپرو' کا درد کو
دُور کرنے والا طاقتور
اثر تیزی سے آپ کے
سر درد تک پہنچکر
جلد سے جلد آرام
پہنچاتا ہے۔



خاص اثر والی 'اسپرو' کھائیے
جلد صحتیاب ہوجائیے"

KEYMER NPP 70/9/70
Lailo Nahaar Newsweekly Registered as a Newspaper with the Post Office in United Kingdom.